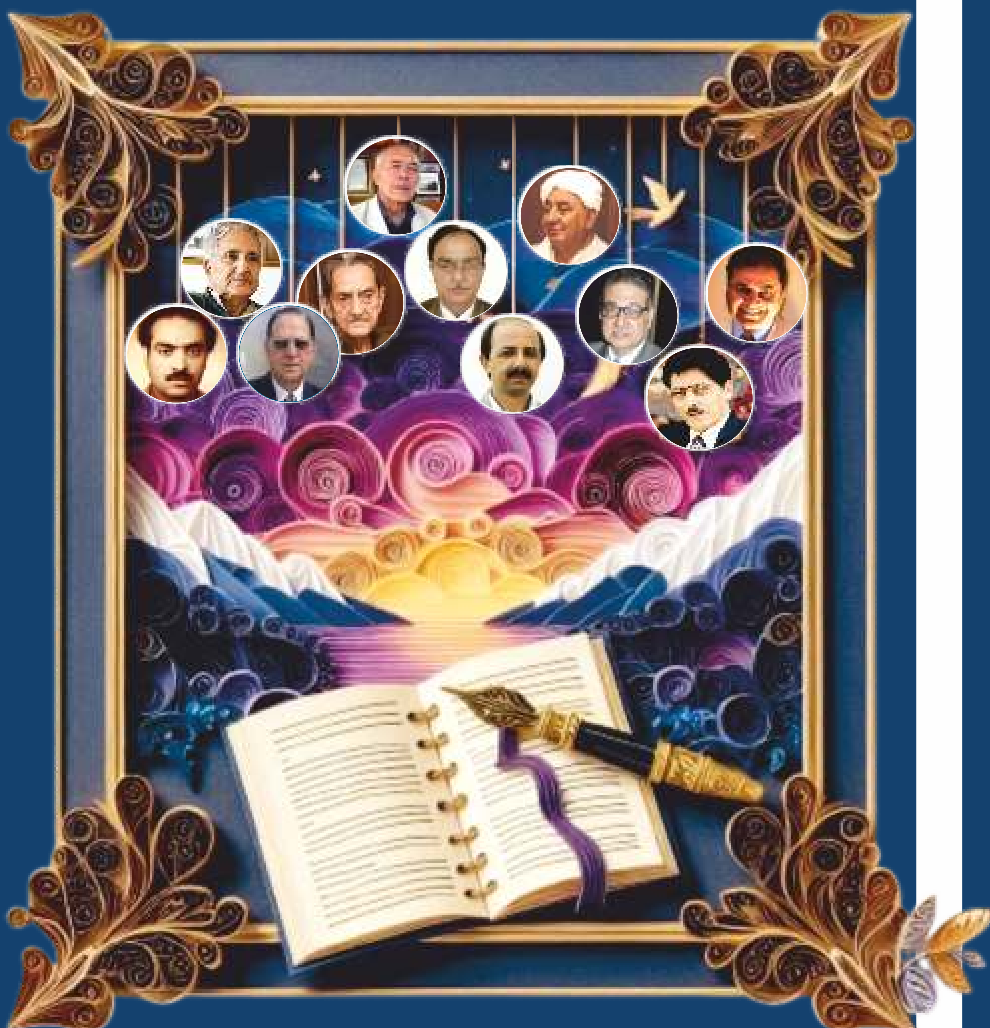
ہمارا ادب



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ہمارا ادب

Hamara Adab 2024 - 2025

Design: Imtiyaz Sharqi

ISSN: 2277-9841

Hamara Adab

Anthology 2024 -2025

J & K ACADEMY OF ART CULTURE & LANGUAGES

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

ہمارا ادب

سرینگر، کشمیر

آپ بیتی نمبر (جلد1) :(2024-25)

نگران	:	ہرویندر کور (جے کے اے ایس)
مدیر	:	محمد سلیم سالکؔ
معاون مدیر	:	سلیم ساغرؔ
معاون	:	محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر :سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپوزنگ/سرورق :امتیاز شرقی

اشاعت : 2024 - 2025

ISSN 2277 - 9841:

مطبع :گورنمنٹ پریس، سرینگر

قیمت :100 روپے

سال نامہ ''ہمارا ادب'' میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آرا سے اکیڈمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ہونا ضروری نہیں۔

☆......خط وکتاب کا پتہ:

محمد سلیم سالکؔ

مدیر ''شیرازہ'' اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

E-mail : sherazaurdu@gmail.com

فہرست

گفتگو بند نہ ہو!

ہر قلم کار کا تخلیقی تجربہ اپنی الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ کسی کو مخصوص اوقات ہی راس آتے ہیں تو کوئی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ کوئی آمد کا متلاشی ہوتا ہے تو کوئی آورد کی مشق و ممارست میں محو رہتا ہے۔ کوئی حظ و لطف کے لئے لکھتا ہے تو کوئی اپنے تجربات کو دلچسپ انداز میں لکھ کر قارئین کی داد و تحسین کا آرزومند ہوتا ہے۔ کوئی تخلیق کے لئے مطالعہ کو ضروری گردانتا ہے تو کوئی مشاہدہ کے عمل کو تخلیق کی اساس مانتا ہے، کوئی ادب کو برائے ادب، تو کوئی ادب برائے زندگی کا نظریہ اپناتا ہے۔ غرض ہر کوئی کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہی تخلیق کو معرضِ وجود میں لاتا ہے۔

جب مختلف مشاہیر کی تخلیقات کے محرکات سامنے آتے ہیں تو عجیب و غریب باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ معروف اردو افسانہ نگار غلام عباس ایک بار جاڑوں کی رات میں اُورکوٹ کے نیچے صرف بنیان پہنے ہوئے سیر کو نکلتے ہیں تو انہیں راستے میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس وقت وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائیں اور ان کا اُورکوٹ اتار دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ اس لطیفہ آمیز خیال نے ان سے ایک شاہکار افسانہ ''اُورکوٹ'' لکھوایا۔ منشی پریم چند نے ''نیرنگِ خیال'' کے مدیر حکیم یوسف حسن کو اپنے افسانوں کی وجہ تخلیق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعے کے اظہار کے لئے کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ جذباتی حقیقت کا

اظہار کرنا چاہتا ہوں، جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں بنتی، میرا قلم نہیں اٹھتا۔ منٹو نے بیدی کو ایک ذاتی خط میں لکھا کہ ''بیدی، تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔'' بیدیؔ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ منٹو کا کیا مطلب ہے کہ میری کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے۔ بیدی مزید لکھتے ہیں کہ مجھے تخیلِ فن پر یقین ہے، جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں من وعن بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ منٹو اکثر کہتے تھے کہ وہ کبھی کبھی سوچے بغیر کسی فرضی کردار کے بارے میں ایک جملہ لکھ دیتے ہیں، پھر اسی کردار سے احوال دریافت کر کے افسانہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار افسانہ کا کردار میری مرضی سے چلنے سے انکار کر دیتا، تو میں اس کو کردار کی نفسیات کے مطابق ہی انجام تک لے جاتا ہوں، جس سے کہانی پیچیدہ بھی بن جاتی ہے۔ منٹو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ فحش نگار تھے۔ ان کی کہانیاں جنس پر مبنی ہوتی ہیں۔ منٹو کی سوچ عام تخلیق کار سے بہت مختلف تھی وہ احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب ایسی داستانیں فضول ہیں، کیوں نہ اس عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر دوسرے مرد کی بغل گر م رہی ہو اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہو، گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا ہو۔ زندگی کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا چاہیئے۔ منٹو کو اس قسم کی کہانیاں لکھنے پر بہت لعن وطعن بھی سہنا پڑا، لیکن انہوں نے اپنی روش آخر تک نہیں چھوڑی۔

رومانی افسانہ نگار سلطان حیدر جوشؔ اپنی افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ افسانہ اس وقت لکھا، جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی

تحریک پیدا ہوئی۔کبھی یہ تحریک دفعتاً وجود میں آئی اور کبھی مہینوں میں اس حد تک پہنچی کہ میں پوری طرح اس کو محسوس کر سکا۔اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے۔کبھی صحبتِ احباب،کبھی ریل کا سفر،کبھی کسی مقام کی سیر اور کبھی کسی غیر معمولی واقعہ کا مشاہدہ۔ایسی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار کے لئے افسانہ تخلیق کرنا ہوتا ہے۔یہ مرحلہ اکثر و بیشتر میں نے رات کی تنہائی میں اور کچھ نہیں تو حقے کی امداد سے پلنگ پر لیٹے ہوئے طے کیا۔واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ صادق کے ساتھ محض ایک خیال،ایک مخصوص جملہ،ایک غیر معمولی تصویر یا ایک نیا مصالحہ دماغ میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔اس مخصوص تحریک کو افسانے کے سانچے میں ڈھالنا بالکل ایسا ہی کام ہے جیسے گوندھی ہوئی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ برنگے کھلونے بنانا ہے۔ممتاز شریں مانتی ہیں کہ میرے افسانے،میرے احساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور میرے احساسات زندگی کی تلخیوں سے بھر پور،جو کچھ دیکھتی اور سنتی ہوں،وہی کچھ اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کرتی ہوں۔تخیلی دنیا میں کھو جانا مجھے پسند نہیں۔مشاہدات کی تصویر کشی میرا مسلک ہے۔چونکہ میں مشرقی ہوں اس لئے مشرق اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی ماحول میرے پیشِ نظر رہتا ہے۔
افسانہ اسی وقت لکھتی ہوں جب شدت کے ساتھ کسی چیز کو محسوس کروں۔میرے نزدیک وہی افسانہ ہے جو حقیقت سے قریب ہو۔روسی ناول نگار ٹالسٹائی پر عالمی شہرت یافتہ ناول ''جنگ اور امن'' کسی آسمانی کتاب کی طرح نازل نہیں ہوا۔اسے لکھنے کے لئے ٹالسٹائی نے بے پناہ ریاضت کی۔انہوں نے نپولین کے حملے کے بارے میں تاریخ کی کتابیں،روسی جرنیلوں کی یادداشتیں،فوجی افسران کے درمیان خط و کتابت اور اس عہد کے اخبارات،رسائل اور جرائد کا مطالعہ کیا۔غرض ہزار ہا صفحوں پر پھیلا ہوا مواد کھنگال ڈالا۔وہ ان روسی بوڑھوں سے جا کر ملے،جو نپولین کی

افواج سے مختلف محاذوں پر لڑے تھے۔ وہ ان میدانوں میں گیا جہاں روسی اور فرانسیسی فوجوں کی لڑائیاں ہوئی تھیں ۔انہوں نے میدانوں کی مٹی اُٹھا کر ان کا رنگ دیکھا ،انہیں سونگھا۔ مٹی کی سگندھ میں فتح وشکست کے رنگ یکجا تھے۔ وکٹر ہیوگو کو نوتر دام کے قدیم کلیسا کی دیوار پر کسی نامعلوم آدمی کا مدتوں پہلے لکھا ہوا ایک لفظ ''مشیت'' نظر آیا، تو وہ سوچنے لگا یہ لفظ یہاں کس نے ،کب اور کیوں لکھا ہوگا۔ یہ خیال اس کے مشہور ناول ''پیرس کا نوتر دام'' کی بنیاد بن گیا۔ عصمت چغتائی لکھتی ہیں ''تنہائی میں لکھنے کی عادت نہیں، چونکہ کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ شور مچتا ہوتا ہے، ریڈیو بجتا ہوتا ہے اور بچے کشتیاں لڑتے جاتے ہیں اور میں لکھتی رہتی ہوں۔''

ہر تخلیق کار اپنی دنیا آباد کرتا ہے اس لئے مشاہیر کے تخلیقی عمل کے محرکات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے تخلیق کاروں کے موضوعات مختلف ہی نہیں بلکہ منفرد بھی ہوتے ہیں۔ بقول غالبؔ

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ جموں وکشمیر کے ادبی منظرنامے پر بھی ایسے کئی روشن چراغ چمک رہے ہیں جن کی پوری زندگی علم وادب کی وادیوں میں گزر گئی ہے۔ اس لئے ادارہ نے بہت عرصے پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان مقتدر شخصیات سے اپنے تخلیقی سفر کے حوالے سے کچھ تحریر فرمانے کی گزارش کی جائے ،جس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ کئی حضرات نے ہماری دعوت کو قبول کر کے پہلی بار اپنے تخلیق سفر کو سمیٹ کر اس کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔اس سے پہلے ہم نے ''شیرازہ'' اردو کے عام شماروں میں ''میرا تخلیقی سفر'' کے عنوان سے ایک کالم شروع کیا تھا۔ جب یہ سلسلہ چل پڑا تو قریباً

گیارہ شخصیات کے ادبی سفر کو کی وقتاً فو قتاً ''شیرازہ'' کی زینت بنایا گیا۔اب چونکہ یہ سلسلہ عمومی شماروں میں محفوظ ہے لیکن قارئین کی سہولت کے لئے اسے ایک ہی شمارے میں پیش کر کے ایک اہم دستاویز کی شکل دی گئی ہے۔امید ہے قارئین ہماری اس کوشش کو حسب سابق قبولیت سے نوازیں گے۔

محمد سلیم سالک
مدیر شیرازہ اردو

●●●

☆......محمد یوسف ٹینگ

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

شوپیان کا قصبہ قدیم شاہ راہِ نمک کے پیر پنچال درّے کے مشرقی جانب ایک پرانا قصبہ ہے۔ کشمیر میں نمک جیسی کھانے پینے میں اِستعمال ہونے والی شئے نہیں ملتی، اِس لئے اِسے پنجاب میں کھیوڑہ کی کانوں سے لایا جاتا تھا۔ یہ سمندر سے حاصل ہونے والے سفوف نمک کے برعکس چٹانوں سے لایا جاتا تھا اور اس کے حوالے سے یہ فارسی کہاوت مشہور ہے۔ ع

ہر کہ در کانِ نمک رفت، نمک شد

گیارہویں صدی عیسوی کے کشمیری ڈرامہ نگار کھیمند ر نے اس راستے کا نام ''لونا سرنی'' درج کیا ہے۔ لونا سر یعنی نمک کی سڑک۔ جب مُغل اِس راستے سے آنے جانے لگے تو اُن کی حشمت کی وجہ سے پُرانا نام دب گیا اور اِسے مُغل شاہراہ کہا جانے لگا۔ اب مغل روڑ کی تجدید ہوئی ہے اور اِس راستے سے پھر آمد و رفت شروع ہوئی ہے۔ اِس راستے پر ہی مغلوں نے مسافروں کی سہولیت کے لئے سرائیں بنائی تھیں جو لاہور سے شروع ہو کر سرینگر تک مسافروں کو بارش برسات سے بچاتیں اور راتوں کو پناہ دیتی تھی۔ سرینگر میں سرایہ بل کا محلّہ اِس کی اب بھی یادگار ہے۔ شوپیان میں بھی ایسی ایک سرائے تھی جس وجہ سے مقامی لوگ اِسے قصبے کی بجائے سرائے کہتے ہیں۔

میں ۱۲؍ مارچ ۱۹۳۵ء کو شوپیاں میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا

ہوا۔اُس دِن ذی الحج کی چھٹی تاریخ تھی ۔ یہ تاریخ اِس لئے یادرہ گئی ہے کہ اُس دن کشمیر میں بانی مسلمانی میر سید علی ہمدانیؒ شاہِ ہمدان کا عُرس منایا جاتا ہے ۔ میں اپنے باپ خواجہ عبدالرزاق بٹ کی پہلی اولاد تھا اور خود میرے والد حاجی غفار بٹ کے تنہا زندہ بیٹے تھے ۔ جب اُنہوں نے سُنا کہ میرا پوتا پیدا ہوا ہے تو اُنہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اُس کا نام یوسف رکھ دیا جائے ۔ ع برعکس نہند نامِ زنگی کافور

اُس کے چار دِن بعد یعنی عیدالاضحیٰ کے روز میرے دادا اِس فانی سرائے سے کوچ کر گئے ۔ قارئین کے ذہن میں یہ سوال اُٹھ رہا ہوگا کہ میں ٹینگ اور میرے دادا 'بٹ' کیسے ہو گئے ...... 'بٹ' ہمارا خاندانی گوتر ہے اور بنیادی طور یہ ایک برہمن پنڈت کے ساتھ جُڑتا ہے ۔ کشمیر میں آج بھی پنڈتوں میں یہ گوتر عام ہے ۔ اِس کا صاف مطلب ہے کہ میرے اجداد کشمیری پنڈت تھے ۔ چونکہ ہماری خاندانی یادداشت تین چار پشتوں سے زیادہ نہیں ہے ۔ غفار بٹ ۔ غفور بٹ ، سبحان بٹ ۔ اس لئے لگتا ہے کہ اُس سے پہلے وہ مسلمان ہو گئے ہوں اور اپنے پرانے مذہب کے ساتھ ساتھ انہوں نے اُس سے وابستہ اجداد کو بھی ذہن سے نکال دیا ہو...... ٹینگ ہماری کِرام یا ''ریژھ'' ہے ۔ اس لئے کہ ہم ایک اونچی جگہ پر رہتے ہیں ۔ ٹینگ کشمیری میں اونچی جگہ کو ہی کہتے ہیں ۔ سلیمان ٹینگ ۔ شالہ ٹینگ ۔ کرالہ ٹینگ وغیرہ ۔ بہرحال ٹینگ کو راقم الحروف نے ہی زیادہ اُبھار کے اپنے گھرانے کی شناخت بنایا ۔ اِس لئے کہ 'بٹ' میں ایسی خاصیت نہ تھی ۔ میں ٹینگ پر چڑھ کر چلانے لگا اور سماں یہ ہے کہ یہ گُر چل نکلا ۔

میرے والد کے دو نکاح تھے ۔ میں دوسری بیوی ہاجرہ بیگم کے بطن سے پیدا ہوا ۔ ہاجرہ بیگم کی شادی میرے والد سے ۱۹۳۱ء کے آس پاس ہوئی ۔ میرا بچپن خاصے ناز و نعم میں بسر ہوا ۔ والد صاحب بہت فیاض بلکہ فضول خرچ تھے ۔ کوئی اُن کے پشمینہ

دُھسے (شال) کی تعریف کرتا تو وہ اُسے دُھسہ ہی بخش دیتے تھے۔ اِس وقت اُن کی شاہ خرچیوں کی تفصیل دینے کا موقع نہیں ہے۔ وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے جاڑے میں راولپنڈی اور لاہور جاتے تھے کہ وہ شہر اُن دنوں کشمیر کی تجارت کے دِساوَر تھے۔ وہاں وہ گھوڑ دوڑ میں بھی اپنا بہت سارو پے پیسہ گنوا دیتے تھے۔ لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ وہ وہاں کشمیر سے جانے والے اچھے اچھے لوگوں کی میز بانی کرتے تھے۔ بخشی غلام محمد صاحب کی بھی انہوں نے لاہور میں تواضع کی تھی۔ انہیں اپنے زبردست حافظے کی وجہ سے وہ یاد تھی۔ اِس لئے جب وہ ۱۹۵۳ء میں وزیرِ اعظم بنے تو اُنہوں نے شوپیان کے دورے میں انہیں بُلا وا بھیجا۔ اُن دنوں میرے والد عُسرت کی زندگی گزار رہے تھے کہ اُن کی ساری تجارت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اُدھر اُن کی صحت بھی بگڑ گئی تھی اور سارا گھر بے حال تھا۔ بد قسمتی اکیلئے نہیں آتی۔ ۱۹۵۲ء میں شوپیان کی بڑی آتشزدگی میں ہمارا مکان، عمر بھر کے مال و اسباب کے ساتھ جل گیا تھا اور ہم سب میری والدہ کے مائیکے میں پناہ گزین تھے۔ بخشی صاحب نے مقامی حکام کو تلقین کی کہ ہمارے مکان کی بحالی کے لئے لکڑی وغیرہ فراہم کریں اور اِس طرح سے ہمیں تھوڑا سا سنبھالا ملا۔

شوپیان میں، میں نے میٹرک تک تعلیم پائی۔ اُن دِنوں وہاں مڈل سکول تک ہی پڑھائی کا سرکاری اِنتظام تھا۔ وہاں ہائی سکول لوگوں نے اپنے خرچ سے قائم کیا تھا اور اُس کے ہیڈ ماسٹر پنڈت دینا ناتھ ہانجورہ تھے۔ بہت ہی شریف مگر نہایت مستعد اور قابل۔ اُنہیں بس واجبی تنخواہ ہی ملتی تھی مگر اُنہوں نے اسکول کو ایک شاہی ضراب خانہ بنا دیا تھا۔ وہیں سے شمیم احمد شمیم اور راقم پڑھ کر سرینگر آ گئے۔

شمیم احمد شمیم سے میری ملاقات ۱۹۴۴ء کے آس پاس ہوئی۔ اُن کے والد تحریک کشمیر کے معلمِ اوّل مولوی عبداللہ وکیل کے فرزند اکبر تھے۔ لیکن شمیم صاحب کی

والدہ خدیجہ بیگم سے شادی کے بعد وہ آسنور گاؤں میں ہی مقیم ہو گئے تھے۔

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں بن میں
لیلیٰ بسی ہے میرے من میں

یہ گاؤں مرزائی مذہب کی اکثریت کا گاؤں تھا مگر خود مولوی یعقوب حنفی مسلمان تھے۔ کچھ دیر کے بعد اُنہیں اپنا گاؤں چھوڑ کر شوپیان آنا پڑا۔ شمیم سے میں جب ملا تو وہ پانچویں پرائمری اور میں چوتھی پرائمری میں پڑھتا تھا۔ وہ چکا چوند والی ذہانت کے مالک تھے۔ ہماری جان پہچان گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ میرے اندر لکھنے پڑھنے کی لگن ہمارے ایک اور دوست خواجہ غلام قادر دیوان نے پیدا کی۔ وہ ایک بڑے تاجر اور دکاندار تھے اور جاڑے میں سیب کا مال لے کر لاہور اور راولپنڈی جاتے تھے۔ اُنہیں شعر و ادب کا بڑا شائستہ ذوق تھا۔ شوپیان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ شمیم اور میں اُن کی نظر میں آ گئے۔ وہ ہمیں کتابیں دیتے اور پھر اُن کے بارے میں ہم سے سوالات پوچھتے۔ وہ اپنے گھر میں ہماری شاندار دعوتیں کرتے۔ وہاں شعر بازی ہوتی۔ کچھ اور صاحبِ ذوق لوگ بھی موجود ہوتے۔ آہستہ آہستہ مجھ میں بھی چنگاری چمکنے لگی۔ دیوان صاحب بعد میں ہمارے مُحسن اور مُربی ثابت ہوئے۔ جب شمیم صاحب ۱۹۶۴ء کے بعد علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تو دیوان صاحب آنکھ بچا کے اُن کی مالی امداد بھی کرتے رہے تاکہ اُن کی والدہ کا بوجھ کسی قدر کم ہو جائے جو مولوی یعقوب کی ۱۹۵۲ء میں موت کے بعد ایک عیال بار گھر کی واحد کفالت دار بنی تھیں اور اُستادی کے پیشے سے کم تنخواہ پاتی تھیں۔ دیوان صاحب ۱۹۶۸ء میں برقِ ناگہانی کا شکار ہو گئے۔ اُن کی وفات پر شمیم صاحب نے اپنے اخبار آئینہ، میں جو مضمون لکھا۔ وہ اُن کے قلم کا ایک شاہ کار ہے۔

بجلی فضا کو چیر کے کب کی گزر گئی

سینے سے میں نے ہاتھ اٹھایا نہیں ہنوز

میری شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ جب میں چودہ برس کا تھا۔میری والدہ اپنے گھر میں ایک بہو دیکھنا چاہتی تھیں۔لیکن انہیں میری کم سنی اور کم فہمی کا کوئی خیال نہیں آیا۔ یہ اُن دِنوں کی ریت بھی تھی میں بچپن سے ہی کچھ بُدھو قسم کا آدمی رہا ہوں۔ مجھے تب تک معاملے کی بھنک نہیں لگی آخر جب تک ایک دن ہمارا خاندانی نائی آیا۔ مجھے بڑے اہتمام سے لایا گیا اور اُس نے میرے بال سنوارنا شروع کئے۔اُن دِنوں میں سبزہ آغاز تھا۔اور میرا پہلا Shave نائی ہی نے کیا۔اُدھر عورتوں نے وُ نہ وُن شروع کیا۔شیرینی کی برسات ہونے لگی۔کانگڑیوں سے عود وعنبر کے بادل اُٹھنے لگے(کشمیر محاورہ دہ گوسہ۔یعنی دھواں شیر کی مانند ہوتا ہے۔)مجھے عطر سے شرابور پانی سے نہلا کر دولہا بنایا گیا۔اُن دنوں موٹر گاڑیوں کا آج کا جیسا سیلاب نہیں تھا اور شوپیان میں شاید ایک دو ہی گاڑیاں رہی ہوں گی بہر حال، دُلہے کو گھوڑے پر سوار کر کے سسرال کی جانب لیا جانے لگا۔ دُلہے میاں کو گھوڑ سواری کا تجربہ ہی نہ تھا۔لہٰذا دونوں طرف سے دو آدمی اُس کو سہارا دے کر تھامے رہے۔ جب برات دُلہن کے گھر پہنچی تو دُلہے کے ساتھ عورتوں کے ونہ ون گاتے طائفے کا استقبال کرنے والی عورتوں کے طائفے سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ مجھے آج بھی اِس میٹھی 'رجز خوانی' کا عالم یاد ہے۔اکتوبر کا مہینہ تھا۔اُن دنوں آج کل کے شاہی محل جیسے شامیانوں کا بھی وجود نہ تھا۔ مہمانوں کی تعداد چوبیس مقرر کی گئی تھی اور یہ کوئی کاغذی فرمان نہ تھا بلکہ اِس پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔بہر حال ہم دُلہن والے کے مکان کے رواق میں بیٹھے۔وہاں ایک مسند بچھائی گئی تھی۔مخمل کا فرش، مخمل کے تکیوں سے سجا ہوا اور کمرے کی چھت تک چینی ریشم کی ایک خوبصورت چادر۔ دُلہے میاں فروکش ہو گئے۔کشمیری وازہ وان ایک مربوط اور مہذب

دعوت ہوتی ہے اور پھر عروسی کی محفل۔ پہلے مسند وغیرہ اور پھر سرپوش لگے ہوئے خوانِ نعمت۔ نوشہ کم عمر تھا، نرم و ملائم فرش پر بیٹھ کر اور گرمی آمیز فضا سے اُس پر غنودگی چھا گئی۔ وہ مسند پر گہری نیند سو گیا۔ بچپن کی نیند بڑی مست ہوتی ہے، ضیافتیں آئیں اور اختتام کو پہنچی۔ لیکن دُلہے کو جگا کر کھانے پر آمادہ نہیں کیا جاسکا۔ مجھے بس اِتنا یاد ہے کہ جب مجھے جگایا گیا تو ضیافت ختم ہو چکی تھی۔ مہمان رُخصت ہو گئے تھے اور میرے سسرال کی چند لڑکیاں زرق برق کپڑے پہن کر اور زیوروں سے لدی پھندی دُلہے کو دیکھنے آئیں۔ اُن کی پوشاک اور شاید اُن کے بدن کی خوشبو مجھے سرشار کر رہی تھی۔ وہ ٹُکر ٹُکر مجھ کو دیکھ رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہی تھی۔ ''ارے اس کی سیاہ آنکھوں کو تو دیکھو۔ سُرمہ لگائے ہوئے لگ رہی ہیں''۔ کوئی میرے کُرتے کو اور کوئی میرے چوڑی دار پاجامے کو چھو رہی تھی۔ اُن کی نظروں میں شوخی تھی اور اُن کے ہاتھوں میں بجلی۔ میں نے بھی ہولے ہولے اُن کے نرم نرم بازوؤں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ کسی ایک نے اپنا بازو زور سے چھڑا لیا اور کہا ''ارے ابھی سے اس میں بدمعاشی کے لچھن ہیں۔ ہماری دُلہن قسمت والی ہے''۔ گھوڑا پیچھے پیچھے، عورتوں کے وَنہ وُن نغمے پھر رس بکھیرنے لگے۔ ہم طلوعِ آفتاب سے پہلے گھر پہنچے، تو ڈولی میں چھپے چاند کو سات پردوں میں اُتار کر اُوپر لے جایا گیا۔

شمیم صاحب اپنے دوست پروفیسر میر نصر اللہ کی بدولت وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کی نظر میں آگئے اور پھر محکمہ اطلاعات کے اُردو رسالے ''تعمیر'' کے مدیر بن گئے۔ بخشی صاحب میرے نام سے بھی واقف تھے۔ اپنے ایک دورۂ شوپیان کے وقت اُنہوں نے میرے والد کو کہا کہ بیٹے کو میرے پاس لاؤ۔ مجھے دیکھا تو کہا کہ مجھے سرینگر میں تمہاری ضرورت ہے۔ وہاں مجھ سے مِلنا۔ جب میں شمیم صاحب کی ہمراہی میں اُن سے ملا تو انہوں نے کہا کہ اِسی کے ساتھ کام کرو۔ اِس طرح میں''

تعمیر'' کا جوائنٹ ایڈیٹر بنا اور جب شمیم کی ترقی ہوئی تو اس کا مدیر۔ پھر اننت ناگ کا ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر۔ اس کے بعد مجھے اچانک کلچرل اکیڈمی کے رسالہ ''شیرازہ'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ سرینگر میں علی جواد زیدی صاحب کے ساتھ کچھ محفلوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ زیدی صاحب مرکزی محکمۂ اطلاعات کے انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے کشمیر آئے تھے۔ بعد میں اپنی قابلیت اور دیانت سے بخشی صاحب کی نظر میں آ گئے۔ انہوں نے زیدی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنایا (ابھی پرنسپل سیکریٹری کا عہدہ وجود میں نہیں آیا تھا)۔ پھر انہیں ۱۹۶۱ء میں کلچرل اکیڈمی کا چارج بھی دیا گیا۔ جب ''شیرازہ'' شائع کرنے کی بات آئی تو اُن کی نظر انتخاب مجھ نابکار پر پڑی۔ مجھے خبر کئے بغیر اُنہوں نے وزیرِ اعظم کو، جو اکیڈمی کے صدر بھی تھے، پروپوزل بھیجا کہ یہ اِس رسالے کے لئے موزوں مدیر ثابت ہوگا۔ لہٰذا اسے محکمۂ اِطلاعات سے اکیڈمی میں تبدیل کیا جائے۔ وزیرِ اعظم نے ہاں کر دی تو مجھے فوراً سے پیشتر محکمہ اطلاعات سے فارغ کر دیا گیا اور میں نے اکیڈمی میں طوعاً و کرہاً جوائن کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اپنی دیہاتی زندگی سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا اور شہر کی زندگی گزارنے میں بہت تامل کر رہا تھا۔ لیکن میری کیا چلتی۔ میں گاؤں کی سیدھی سادھی زندگی کو ترک کر کے شہر کی پیچ در پیچ گلیوں میں کھو گیا اور ابھی تک اپنی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ ع

اِن اونچے شہروں میں پیدل صرف دیہاتی ہی چلتے ہیں
ہم کو بازاروں سے اِک دِن کاندھے پر لے جانا بابا

میرے بچپن کی ایک اہم یاد وہ ہے جب ۱۹۴۵ء میں جواہرلال نہرو، نوجوان اندرا گاندھی، خان عبدالغفار خان اور شیخ محمد عبداللہ کونسر ناگ کی سیر کے لئے آئے۔ کونسر ناگ قدیم کشمیر کی 'ناوکا بندھن' کی چوٹیوں کے آغوش میں نیلے پانی کا ایک خوبصورت چشمہ ہے۔ نیل مت پُران کے مطابق کشپ ریشی نے ستی سر کی جھیل سے کشمیر

کا 'سبز گوہر' حاصل کرنے کے لئے اِسی جگہ کے آس پاس اپنی کشتی باندھ رکھی تھی۔ اِس چشمے سے ہی 'وسوکا' یعنی وِشوندی نکلتی ہے جو بجبہاڑہ سے آگے گھمبیر سنگم کے پاس رنبی آرہ سے واصِل ہو جاتی ہے۔ جواہر لال نے اِس دورے میں شیخ محمد عبداللہ سے دوستی کی وہ ڈور اُستوار کر لی۔ اُن دِنوں پنڈت رام چندر کاک، مہاراجہ ہری سِنگھ کے وزیر اعظم تھے۔ شیخ صاحب کی محبت میں نہرو کی مہاراجہ اور کاک صاحب سے ٹھن گئی تھی۔ چنانچہ اُن کے آنے کا اعلان ہوا تو قصبے میں دفعہ 144 نافذ کر دی گئی۔ پولیس کی تازہ کُمک پہنچ گئی۔ لیکن جب جواہر لال شوپیان کے بازار میں داخل ہوئے تو اُن کی موٹر کی 'بیں بیں' سن کر گویا لوگ زمین سے پھوٹ پڑے۔ سڑک کے دونوں جانب قطاریں بندھ گئیں اور پنڈت جی کی کار اُن میں سے ایسے چلتی رہی جیسے آنکھوں کی پلکوں کے درمیاں نظر چلتی ہے۔ اُن دنوں موٹروں کے باہر ایک Foot Paid بھی ہوا کرتا تھا جس کو اب ٹایوٹا، فورڈ اور ماروتی نے اندر چُھپا دیا ہے۔ جواہر لال اپنے پیر فُٹ پیڈ پر رکھے ہوئے اور ایک بازو سے کُھلی کھڑکی کو سنبھالے ہوئے کھڑے ہو گئے اور عوام کو ہاتھ لہرا لہرا کر سلام کرتے رہے۔ شیخ صاحب کار کے اندر بیٹھے رہے۔ شوپیاں میں آج کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں محکمہ جنگلات کا ایک بنگلہ بنا ہوا تھا جس کے سامنے ایک بڑا صحن تھا۔ نہرو جی کا رات کا قیام وہیں مُقرر رہا تھا۔ نہرو جی نے فارسٹ ہاؤس کے برآمدے سے ہجوم کو سلام کیا۔ مجھے مقامی لیڈروں نے بنگلے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ جوں ہی جواہر لال نہرو سیڑھیوں کے پاس پہنچے میں نے اپنے ہاتھوں میں تھاما پھولوں کا ہار اُن کی طرف بڑھایا۔ نہرو نے گردن جُھکا لی اور میں نے یہ ہار انہیں پہنا دیا۔ نہرو نے مجھے گلے سے لپٹا لیا۔ اُن کے گلے میں پھولوں کے بے شمار ہار ڈالے گئے تھے۔ انہوں نے وہ سارے نکال کر مجھ ناتواں پر ڈال دیئے اور میں جیسے پھولوں کے ایک گل دستہ میں تبدیل ہو گیا۔ شیخ عبداللہ جو ایک نفیس شال پہنے ہوئے

تھے، تقریر کرنے لگے۔لوگ سامنے آئے، انہوں نے اپنے محبوب لیڈر کو دیکھا تو وہ دریا کی موجوں کی طرح مچلنے لگے۔شیخ صاحب نے مختصر سی تقریر میں کہا کہ آج ہمارے مُعزّز مہمان آئے ہیں۔کشمیریوں کی روایت ہے کہ وہ مہمانوں کی محبت سے تواضع کرتے ہیں۔

جب شوپیان کی نئی جامع مسجد کی تعمیر کا آغاز ہوا، پرانی مسجد زین العابدین بڈشاہ کی باقیاتِ صالحات میں سے تھی۔کشمیر کے کلاسیکی فن تعمیر کا نمونہ۔چھت کے اوپر بھوج پتر (برزہ) اور اُس پر مٹی۔مٹی سے گلِ لالہ اُگتے تھے اور گرمی کے موسم میں لہلہاتے رہتے تھے۔یہ پانچ سو سال کے بعد اب بوسیدہ ہو گئی تھی۔

غلام محمد میر راجپوری ۱۹۵۰ء کے بعد نیشنل کانفرنس کی قیادت کے ایک حصے سے پرخاش کا شکار ہو کر شوپیان میں آکر اپنا ڈیرہ جمانے لگے۔اُن کی اُس وقت کے مشیرِ مال مرزا محمد افضل بیگ سے ٹھن گئی تھی۔وکالت کا بھی نام تھا۔لیکن اُن کا ڈیرہ ایک سیاسی اکھاڑہ بن گیا جہاں صبح درجنوں لوگ جمع ہو کر گپ شپ کرتے تھے۔میرے والد خواجہ عبدالرزاق کے راجپوری صاحب کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔لہٰذا کبھی کبھار میرا بھی اُن کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔۱۹۵۳ء کی گرمیوں میں اپنے دوستوں دیوان صاحب وغیرہ کے ساتھ کونسر ناگ کی سیر کو گیا تھا۔ہم لوگ اِس سفر کے ایک خوبصورت پڑاؤ یعنی کونگہ وٹن میدان کے واحد ریسٹ ہاؤس میں ڈیرہ جمائے تھے کہ اچانک ہرکاروں کی ایک ٹولی آن پہنچی۔

معلوم ہوا ہے کہ ریاست کے مشیر مال مرزا محمد افضل بیگ کونسر ناگ جاتے ہوئے آج رات کونگہ وٹن میں گزاریں گے۔کونگہ وٹن میں ایک چھوٹا سا فارسٹ بنگلہ تھا جہاں ہم طالب علموں وغیرہ نے شب گزاری کے لئے اپنے کپڑے لتّے وغیرہ رکھے تھے۔ہرکاروں نے فوراً ہمارے سامان کو باہر کر دیا۔ہم چیختے چلاتے رہے۔مگر

ہماری کون سنتا؟ بہرحال، وہاں کچھ بکروالوں کے ڈیرے بھی اِدھر اُدھر اپنے ریوڑوں کی رکھوالی کے لئے کھڑے تھے۔ہم نے سوچا کہ اِن کے ساتھ الاؤ جلا کر ہم بھی رات بھر گاتے بجائے رہیں گے۔

اِتنے میں تازی گھوڑوں پر مشیرِ مال صاحب کی سواری آ گئی۔اُن کے ساتھ کُچھ بڑے افسر وغیرہ تھے جن میں خواجہ غلام محمد چکن نمایاں تھے۔ بیگ صاحب بنگلے میں پوشاک تبدیل کرنے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ باہر ہی فروکش ہو گئے۔ایک بڑا سا حقہ ساتھ آیا تھا اور وہ اِس کو گڑگڑاتے ہوئے کش لے کر دُھواں اُڑاتے رہے۔ہم لوگوں کی شامت آئی کہ ہم بھی اُن کو سلام کریں۔اُن کے سامنے گئے تو انہوں نے ہماری طرف نظر اُٹھائے بغیر کہا کہ کیوں آئے ہو؟ ہم نے کہا سلام کرنے آئے ہیں۔اُنہوں نے کہا وعلیکم السلام۔جاؤ سیر کرو۔خود بھی خوش رہو مجھے بھی خوش رہنے دو۔ہمارے ایک ساتھی نے مجھے آگے کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا عبدالرزاق بٹ صاحب کا فرزند ہے۔اُنہوں نے کہا کہ خوبصورت لڑکا ہے مگر اِسے گھر چھوڑ کے نہیں آنا چاہئے تھا۔بیگ صاحب کو کیا معلوم تھا کہ ایک وقت وہ میری رفاقت کے لئے بے قرار رہیں گے اور قاصدوں کی قطاریں میرے پاس روانہ کرتے رہیں گے۔

●●●

(ٹینگ صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ کے خصوصی شمارہ ’’محمد یوسف ٹینگ نمبر‘‘ سے ماخوذ ہے، جو 2011 میں شائع ہوا ہے۔ادارہ)

☆...... غلام رسول سنتوشؔ
کشمیری سے ترجمہ: غلام نبی آتشؔ

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

میرے والد صاحب پولیس میں تھے۔ جس زمانے میں وہ پُلوامہ میں سرکاری ٹریجری کی حفاظت پر مامور ہوئے، میں اپنے محلے کے جبری سکول میں چوتھی جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ جبری سکولوں، جن میں بچوں کو زبردستی داخل کیا جاتا تھا، کا انتظام مہاراجہ ہری سنگھ نے کیا تھا۔ ہمارا ہندو ماسٹر جی تعطیلات کے دوران بھی ہمیں گھروں سے پکڑ کر جبراً سکول پہنچایا کرتا۔ پُلوامہ کے مِڈل سکول میں دوسری جماعت تک ڈرائنگ سِکھائی جاتی تھی۔ ڈرائنگ نوٹ بُک پر ایک اِنچ مربع خانے بنے ہوتے تھے۔ ڈرائنگ ماسٹر تختۂ سیاہ پر خانے بنا کر اُن میں گلاس اور جگ وغیرہ بناتا تھا اور طالب علم اُس کی نقل کرتے رہتے تھے۔ ڈرائنگ ماسٹر بھاسکر جو قریب کے گاؤں کا باشندہ تھا۔ شِو ناتھ رینہ اور دینا ناتھ ولی بھی وہیں سکونت پذیر تھے۔ ڈرائنگ ماسٹر کی بنائی ہوئی ایک چھوٹی سینری، جو ڈرائنگ کلاس روم میں رکھی ہوئی تھی، مجھے اتنی پسند تھی کہ بار باراُس کی طرف غور سے دیکھتا رہتا۔ میرے پرائیویٹ ٹیوٹر عبدالاحد پیرزادہ، جو ایک مُصوِّر بھی تھے، کا مکان مسجد کے قریب تھا۔ اُن کی بنائی ہوئی ایک تصویر، جِس میں جھنڈہ تھامے ہوئے سِکاؤٹ بنایا ہوا تھا، ہمارے سکول میں صفائی کی ٹرافی کے طور پر اِستعمال کی جاتی تھی۔ یہ ٹرافی ہر ماہ اُس کلاس کو دی جاتی جو صفائی میں اول آتی۔ اُس زمانے میں سکولوں میں صفائی کا ہفتہ منایا جاتا تھا۔ طالب علم سارے گاؤں کی صفائی

کرتے تھے۔ایک دِن میرے پرائیویٹ ٹیوٹر گھر میں نہیں تھے۔کمرے میں کھلا کلر بُکس پڑا تھا۔بُرش ہاتھ میں لے کر میں نے اپنی نوٹ بک میں اُس کی تصویر نقل کی۔ اُنہوں نے ایک نکاح نامے پر حاشِیہ بنایا تھا۔تصویر میں رنگ بھرتے بھرتے میں نے رنگ کی چھینٹوں سے نکاح نامے کو خراب کر دیا۔یہ میری پہلی رنگ بستہ تصویر تھی۔تصویر کشی کی طرف میں بچپن سے راغب تھا۔

والد صاحب واپس سرینگر تبدیل ہو گئے تو میں پانچویں جماعت میں تھا۔ وہاں ہمارے محلے کے قریب بابا پورہ مڈل سکول میں مجھ کو داخل کیا گیا۔اس سکول میں خاطر خواہ طریقے پر ڈرائنگ سکھائی جاتی تھی۔ڈرائنگ ماسٹر سورگیہ شِو ناتھ رینہ ماہرِ مُصّور مانے جاتے تھے۔اِس سکول کا ڈرائنگ ہال بہت مشہور تھا۔دیواروں پر اِنسانی شبیہات ، پھولوں اور پرندوں کی تصویریں ،حیوانوں کی پلاسٹر مورتیاں ، کپڑے ، درختوں کی شاخوں اور دھاگے سے بنی حیوانوں کی تصویریں وغیرہ سجائی گئی تھیں۔ ایک دیوار پر مہاراجہ ہری سنگھ کی ایک پینسل سے بنائی گئی تصویر بھی لگائی ہوئی تھی۔اس ڈرائنگ ہال میں کسی طالب علم کی بنائی ہوئی تصویر کو جگہ مِلنا ،طالب علم کے لئے عزت کی بات سمجھی جاتی تھی۔مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ماسٹر جی نے ہاکی بال بنانے کو کہا۔ ہاکی بال کا ماڈل سامنے رکھ کر سارے طلبا نے یہ ہاکی بال پرکار سے بنائی۔سبھوں کی خوب پِٹائی کی گئی۔میں نے فری ہینڈ ہاکی بال بنائی اور پِٹائی سے بچ گیا۔چھٹی جماعت میں ایک بار ماسٹر جی نے کہا، جو طالب علم یکے بعد دیگرے تیرا "Very Good " حاصل کرے گا،اُسے انعام دیا جائے گا۔انعام کے طور پر ایک آنہ یعنی چار پیسے دئے جاتے تھے۔اپنی اردو کتاب میں مرزا غالبؔ کی تصویر دیکھ کر میں نے تصویر بنائی۔میری بنائی ہوئی مرزا غالبؔ کی یہ تصویر اس قدر پسند کی گئی کہ اس کو ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں لگایا گیا اور مجھے چار آنے بطورِ انعام دیئے گئے۔

میں نے میٹرِکولیشن کا امتحان سرکاری سکول سے 1945ء میں پاس کیا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ ملازمت کا پیشہ اختیار کروں لیکن میں سرکاری ملازمت کو رشوت خوری کا ذریعہ سمجھتا تھا، جو مجھے قطعاً ناپسند تھا۔ اِس لئے نوکری نہ کرنے کا فیصلہ تھا۔ اسی زمانے میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا، تاہم اُنہوں نے سُفارش کروا کے محکمۂ خوراک میں روزانہ اُجرت پر نوکر رکھوایا تھا۔ ایک مہینے کیلئے بیس روپے تنخواہ دی جاتی تھی۔ غیر حاضر رہنے یا کام پر دیر سے پہنچ جانے کی پاداش میں پورے دِن کی مزدوری کاٹ لی جاتی تھی۔ میرے ہم درس مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالجوں میں داخلہ پا گئے۔ میری خواہش تھی کہ کم از کم مصّوری سیکھنے کے لئے ٹیکنیکل کالج میں داخلہ پاؤں۔ محکمہ خوراک کی نوکری تیاگ کر میں رنگ سازی کرنے لگا۔ اب میں سب کی دیواروں پر لکھنے کا کام کرتا تھا۔ اردو میں لکھنے میں دھیرے دھیرے میری مہارت بڑھتی گئی ورنہ میں نیم تجربہ کار محض چار پیسے کمانے کے لئے لِکھائی کرتا رہتا تھا۔ مہاراجہ ہری سنکھ کے محل میں بھی میں نے رنگ سازی کی ہے۔ دیواروں پر آویزاں Land Scapes پر میری نظریں ٹِکی رہتی تھیں۔ میری آرٹ گیلری تصویروں کی ایک دکان تھی، جہاں ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کے پرنٹ خریدتے تھے۔ میں گھنٹوں ان تصویروں کو دیکھتا رہتا، گھر جا کر اُن کی نقلیں بنا لیتا۔ قوتِ خرید ہونے کے باوجود یہ تصاویر خرید نہیں سکا۔ ان میں سے کئی ایک آج بھی میرے حافظے میں ہیں۔ جو فنکار یہ تصویریں بناتا تھا، چند سال قبل میں اُس سے ملا۔ وہ راجستھان کا رہنے والا ناتھ دُوراہ نامی فنکار ایک سیدھا سادھا پیر مرد تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔

میں نے پہلی بار 1953ء میں اپنی تصویروں کی نمائش نیڈوز ہوٹل میں کی۔ اِس نمائش کا اِفتتاح سورگیہ دُرگا پرشاد دھر کو کرنا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سورگیہ سوم ناتھ

بٹ نے دھر صاحب کو اِس بارے میں میری اِلتجا گوش گزار نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر کرن سِنگھ نے اِس نمائش کے دوران دو تصویریں خرید لیں، اس طرح ڈاکٹر صاحب میرے اولین خریدار تھے۔

1950ء میں راقم الحروف ایک پنجابی ہندو لڑکی کے دام محبت میں گرفتار ہوگیا۔ وہ عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال چھوٹی تھی۔ حالت یہ تھی کہ ہم جولیوں کے ساتھ کھیلتی تھی اور میرے ساتھ بچپنے کی عشق بازی بھی کرتی تھی۔ اس کا طِفلانہ پن اور میری اُٹھتی جوانی نے عشق کے جھگڑے کو جنم دیا۔ میں جانتا تھا ہماری یہ عشق بازی انجام تک نہیں پہنچ پائے گی مگر ارادہ کئے ہوئے تھا کہ کم از کم اُس کے ''سنتوش'' نام کو نہ صرف مُلک میں بلکہ ساری دُنیا میں مشہور کروں گا۔ میں نے اُس کا نام اپنا لیا۔ کہتے ہیں کہ پیدائش کے وقت میرا نام ''ولی'' رکھا گیا تھا۔ پیر صاحب کی ہدایت پر بجائے ولی میرا نام ''لسہ'' رکھا گیا۔ بعد میں میرا نام غلام رسول ڈار ہوگیا۔ یہ نام بھی لوگوں نے بُھلا دیا۔ میرے عشق کا قضیہ اونچے ایوانوں تک پہنچ چُکا تھا۔

مرحوم بخشی غلام محمد نے 1958ء میں کلچرل اکیڈمی وجود میں لائی۔ سینٹرل کمیٹی منتخب ہوئی، مجھ کو بھی اُس کا رُکن چُنا گیا۔ کامِلؔ صاحب، برج کِشن مدن اور رراقم بالترتیب ادب، مُصوّری اور سنگیت اور ناٹک کے لئے ایڈوائزری کمیٹی کے رکن بنائے گئے۔ مرزا کمال الدّین شیداؔ اکیڈمی کے سیکریٹری کے متعلق میرے ساتھ صلاح ومشورہ کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں کامِلؔ صاحب اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔

آخر وہی ہُوا جس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ سنتوش کی شادی ہوگئی جو بالآخر ناکام ثابت ہوئی۔ جس شخص کے ساتھ اُس کی شادی رچائی گئی اسے کسی اور لڑکی کی محبت میں گرفتار دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ وہ طعن وتشنیع کا شکار ہوگئی۔ اُس کی

ڈوبتی نیّا کو کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ باپ خوش تھا کہ بلا سر سے ٹل گئی۔ ماموں اِس لئے خوش کہ جوں توں کر کے ناک بچ گئی۔ بار بار بڑے بوڑھے اور قرابت والے معاملہ سلجھانے کیلئے بُلائے جاتے لیکن بے سُود۔ میری اکثر نظمیں اُسی زمانے میں تخلیق ہوئی ہیں۔

اسی زمانے میں حکومتِ ہند نے میرے حق میں وظیفہ منظور کر دیا۔ میں نے عرضی میں لِکھا تھا کہ سور گیہ این۔ ایس۔ بینڈرے جو بروڈا مصوری کالج میں شعبۂ مصوری کے سربراہ تھے، میں ان سے تربیت حاصِل کرنے کا خواہاں ہوں۔ اُن ہی کی ہدایت کے مطابق مجھ کو اس کالج میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ وظیفے کی رقم اڑھائی سو روپے تھی۔ اس رقم میں سے اپنی والدہ کو پچاس روپے بھیجا کرتا تھا۔ اپنے عزیز دوست ترلوک کول کا تھوڑا بہت خرچہ بھی برداشت کرتا تھا۔ باقی رقم تربیت میں کام آنے والے سامان اور خورد و نوش پر خرچ ہوتی تھی۔

بروڈا پہنچنے سے پہلے میں لینڈ سکیپ پینٹر تھا۔ میری تصویروں پر Cubicism کا گہرا اثر تھا۔ میں للتِ کلا اکیڈمی کے پہلے ایگزیبشن میں سہ سمتی تصویریں لے کر شامل ہو گیا۔ بینڈرے صاحب بھی کیوبک اِزم کے زیرِ اثر اِنسانی شبیہات بناتے تھے۔ بینڈرے صاحب کی یہ بات کہ ''لینڈ سکیپ بنانا آسان ہے اور انسانی شبیہہ مُشکل'' سُن کر میرے اندر نیا ارادہ اور جوش اجاگر ہو گیا۔ میں نے لینڈ سکیپ نہ بنانے کا فیصلہ کیا اور رات گئے تک بروڈا ریلوے اسٹیشن پر سکیچنگ کرتا رہتا تھا۔ آج تک یہی روایت تھام رکھی ہے۔ کالج سے ملحقہ چڑیا گھر میں سکیچنگ کرنا میرا معمول بن گیا تھا۔ میں نے مہابلی پورم اور کونارک مندروں میں سکیچنگ کرتے کرتے صحیح معنوں میں انسانی شبیہات بنانا سیکھ لیا۔ بروڈا آنے سے پہلے، جبکہ میں انسانی شبیہات نہیں بناتا تھا، مجھے احساس ہو چُکا تھا کہ ہماری مصوری میں انسانی شبیہہ سازی

کا تعلق ہماری روایات کے ساتھ ہونا چاہیے۔ سری لنکا کے مُصّور پکاسُو کا گہرا اثر بھی تھا۔ شری فدا مقبول حسین کی ایسی انسانی شبیہات پر یورپی مُصوری اثر انداز تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے مُصوروں نے انسانی شبیہہ سازی اپنی مورتی کلا سے سیکھی تھی۔ دوسری طرف بنگال سکول براہِ راست اجنتا وغیرہ کی شبیہوں کو از سرِ نو مصوری میں شامل کر رہا تھا۔ واش تکنیک والی تصاویر میں جاپانی مصوری کا اثر تھا۔ اس تکنیک کے ذریعے تصویروں میں روحانی ماحول اُبھرتا تھا۔ شبیہہ سازی سیکھ کر میں مُخمصے میں تھا کہ میری شبیہات کیونکر ہندوستانی روایات کی آئینہ داری کرسکیں گی۔ مجھ پر Cubicism کا گہرا اثر تھا۔ مارکسی نقطۂ نظر بھی پکاسُو کے قریب تر لاتا تھا۔ پکاسُو کی خاص تصویر ''گوآرنیکا'' کمیونسٹوں کو بہت پسند تھی۔ میں نے پکاسُو کی اس طرز کی کئی تصویریں بنائیں جو کبھی کسی کو نہیں دکھائی ہیں۔ اِس نوع کی ایک تصویر مشہور کشمیر رسالے ''کونگہ پوش'' کے سرورق پر چھپی ہے۔ یہ ایک وُڈکٹ یعنی لکڑی پر تراشی ہوئی تصویر تھی۔ اس میں ایک ماں اپنے مردہ بیٹے کو گود میں لے کر روتی دکھائی گئی ہے۔ ایک اور تصویر میں کشمیری ملاح ہے جس کو ناؤ کھیتے ہوئے دِکھایا گیا تھا۔ علامتی طور پر یہ ایک سیاسی تصویر تھی۔ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں رکھنے کیلئے بخشی غلام محمد نے دوسرے مُصوروں کی تصویروں کے ساتھ میری یہ تصویر بھی خریدوائی۔ یہ تصویریں وہاں لگائی گئیں تھیں اور بعد میں غائب ہوگئیں۔ چونکہ میری تصویروں پر Cubiscism کا گہرا اثر تھا اِس لئے کشمیری انسانی شبیہات بھی اسی اثر کے تحت بنایا کرتا تھا۔ بیندرے صاحب کے کہنے پر میں نے ایک الگ نوع کی انسانی شبیہہ بنائی، جس میں رنگ ثانوی درجہ رکھتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک مخطوط تصویر تھی۔ اِس تصویر میں ایک کسان کی بیوی سر پر ٹوکری اٹھائے کھیت کی طرف جاتی دکھائی گئی تھی۔ ٹوکری میں چائے سے بھرا سماوار رکھا ہُوا تھا۔ عورت کے ساتھ اُس کا چھوٹا بیٹا بھی بنایا گیا تھا،

جس کے ہاتھ میں کوئل اور کوئل کی چونچ میں دھان کا خوشہ رکھا گیا تھا۔ اِس تصویر کا عنوان ''امن'' تھا۔ 1957ء میں اس تصویر کو للتِ کلا ایوارڈ دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس تصویر کو گولڈ پلیک ملنے والا تھا لیکن عین موقع پر جوری Jury نے رائے بدل دی اور اسے دس ایوارڑوں میں سے ایک ایوارڈ دیا گیا۔ یہ بھی سُنا گیا کہ ترلوک کول کی تصویر کو بھی انعام ملنے والا تھا۔ اس سب کی وجہ تجریدی اور روایتی فن سے متعلق آرا کا تضاد اور بنگال سکول میں ڈائمینشن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری تصویر کو انعام ملے گا۔ قرضہ بھی چُکانا تھا۔ اس بات کا اطمینان تھا کہ ایوارڈ ملے گا تو تھوڑا بہت قرضہ چُکا پاؤں گا۔ وظیفے کی مقررہ مُدت بھی ختم ہوچکی تھی۔ ایکسٹینشن کی عرضی بھی نامنظور کر دی گئی۔ اب واپس کشمیر جانا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ نیشنل گیلری کی طرف سے ایک ہزار روپے کے عوض میری تصویر خریدے جانے کی پیشکش آ گئی۔ اُس زمانے میں یہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی، میں گویا شادی مرگ ہو گیا۔ بروڈا نے مجھے بہ حیثیتِ مُصّوِر شہرہ دلایا اور افسانہ نگار بھی بنا دیا۔ کالج کے طالب علم سٹڈی ٹیور پر مہابلی پورم گئے تھے۔ ٹولیاں بنا کر خود کھانا پکاتے تھے۔ عام طور پر پوریاں اور سبزیاں کھائی جاتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہماری جوٹھن کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ان بچوں میں ایک ایسا بھی تھا جس کو دیکھ کر مجھے اپنا چھوٹا بھائی یاد آتا تھا۔ اِس لئے میں زیادہ سے زیادہ پوریاں لیتا اور اُس بچے کو دیتا تھا۔ کالج کینٹین میں ایک چھوٹا کُتا ایک میز سے دوسری میز تک دوڑتا رہتا اور جوٹھن کے ٹکڑے کھاتا رہتا تھا۔ ان دونوں جوٹھن کھانے والوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا اگر میں افسانہ نگار ہوتا تو ان کو موضوع بنا کر افسانہ لِکھ دیتا۔

مجھے یاد ہے اُن ہی دنوں فِلم Spring Comes to Kashmir بنی تھی۔ ایمہ صاحب نے اس کو موسیقی دی تھی۔ رتن پورمو اور میں نے یہ فِلم دیکھی تو بے

قرار ہو گئے۔ بوریا بستر لے کر رات سٹیشن پر گزاری۔ جوں توں کر کے ٹرین میں سوار ہو گئے‘ راستے میں ایک دو بار ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں جا کر دروازوں پر استادہ رہ کر یہ سفر طے کیا۔ دلی سے پٹھانکوٹ پہنچ گئے۔ یہاں ایک دن اور ایک رات کے لئے رُکنا پڑا۔ پہلے سیاحوں کو بس مہیا کی گئیں۔ بانہال ٹنل بند پڑی تھی۔ اِس لئے سامان خود اُٹھا کر ٹنل پار کر کے دوسری بس میں بیٹھنا پڑتا تھا۔

بروڑا سے واپس آ کر میں مکمل پروفیشنل مُصوّر بن گیا تھا۔ اب بھی ادھر ادھر کام پا کر آزوقہ حاصل کر لیتا۔ کمار گیلری دلی کبھی کبھی میری تصویریں بیچا کرتی تھی۔ بروڑا میں قیام کے دوران میں نے بمبئی میں تصویروں کی ایک نمائش کی تھی۔ آبی رنگ والی تصویروں کو بنانے کے لئے میں نے برش کے بجائے بلیڈ استعمال کیا تھا۔ روغنی تصویروں میں الُو بطور علامت ابھارا گیا تھا، اُس سماج کی علامت جو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے۔ کشمیر سے باہر الُو کو دانائی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ایک دن پرائمر ہوٹل میں علی محمد لون نے مجھ سے کہا کہ ’’تم اُردو میں نہیں لکھ سکتے۔‘‘ میں نے اُسی وقت ناول لکھنے کا ارادہ باندھ لیا۔ بروڑا نے نے مجھے ’’سمندر پیاسا ہے‘‘ ناول کا موضوع دیا۔ اِس ناول کا مرکزی کردار مُصور کشوری کول ہے۔ ناول میں اُس کا نام شگُنت ہے۔ شگُنت مصوِر ہے اور بچپن سے تپ دق کا شکار ہے۔ اس بیماری نے اس کی تمام خواہشات ختم کر دی تھیں۔ یہ ناول سینی ٹورِیم سے شروع ہو کر کشمیر سے گُجرات اور گُجرات سے مہاراشٹر تک پھیلتا جاتا ہے۔ اردو ادب میں مصوری کا نظریہ محض تاج محل تک محدود ہے۔ اس ناول میں پہلی بار مُصوّر کی صحیح عکاسی موجود ہے ......‘‘ کمرے میں داخل ہو کر میں نے ہاجرہ کو بستر پر اوندھے منہ لیٹے دیکھا۔ ویسی ہی ایک تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ دُھند میں لپٹی ہوئی ایک پرچھائی سی،

فضا میں تیرتا ہوا ایک سایہ سا، بے رنگ، بے جان، جیسے تصویر بھی دق زدہ ہو۔ ہاجرہ کی طرح تصویر میں بھی مٹتے نقوش اور پھیکے پھیکے سے رنگ تھے۔ جیسے ہاجرہ کو ہی دیوار پر لٹکا یا گیا تھا............ایک جھیل تھی، قبر کی سی خاموشی لئے۔ سفیدے کے درخت تھے گُم سُم۔ کِسی غیبی حُکم کے مُنتظر، مرگ آلودہ سناٹے میں جیسے پھیلے ہوئے پہاڑ تھے۔ (آسمان کی طرف بانہیں پھیلائے ہوئے) جیسے چاند کو اپنی بانہوں میں دبوچ لینا چاہتے ہوں، لیکن چاند کہیں نہ تھا۔ ہاجرہ کی طرح خاموش تصویر تھی۔ ایک دق زدہ لڑکی کی تصویر......رات کی تاریکیوں میں دو بجھتے دیوں جیسی آنکھیں، دو جلتے ہوئے جیسے خزان زدہ چنار پت جھڑ کی ہواؤں سے تھر تھر کانپ رہے ہوں۔ جیسے چنار کے سُوکھے پتوں کے ہاتھ دِل کی دھڑکنیں ٹٹول رہے ہوں......''۔

میری شادی سنتوش کے ساتھ ہو چکی تھی جب میں نے یہ ناول مکمل کر دیا۔ اِس شادی سے پہلے ٹھاکر پونچھی نے میری داستان عشق سے متعلق ''اب مجھے انتظار نہیں'' عنوان کے تحت ناول لکھا تھا۔ اس ناول کے شائع ہونے سے پہلے چونکہ سنتوش (توشہِ) کے ساتھ میری شادی ہوگئی۔ ٹھاکر پونچھی کو اپنے ناول کا نہ صرف عنوان تبدیل کرنا پڑا بلکہ اُس کا آخری حِصہ بھی نئے سرے سے لکھنا پڑا۔ اُس نے ناول کا عنوان ''قفس اُداس ہے'' رکھا۔ بروڑا میں راقم الحروف کچھ مہینوں کے لئے بانسری بجانا سیکھ رہا تھا لیکن وظیفہ نامنظور ہونے کے نتیجے میں میرا یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔ سنطور بجانے کا شوق بھی تھا لیکن وہ بھی پورا نہ ہوا۔ گرمیوں کی تعطیلات کے دوران میں کشمیر آیا کرتا تھا، توشہ کا حالِ زار دیکھ کر میرا رؤم رؤم کانپ اُٹھتا تھا۔ اُسے دیکھے بغیر میں بے آرام ہو جاتا تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کی حالت مجھے رُلاتی تھی اور اُسے نہ دیکھ کر پریشانی اور بے چینی لاحق رہتی تھی۔ اب وہ میکے میں مصیبت کے دن گزار رہی تھی۔ دوسال بعد بروڈا سے واپس آ کر ہماری شادی ہوگئی۔

میں جس زمانے میں بروڈا میں تھا، علی محمد لون دِلی میں تھے۔ بروڈا سے واپسی پر ضرور کچھ دن کے لئے لون صاحب کے یہاں قیام کرتا تھا۔ ان ہی دنوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ۔ لون صاحب فیملی سے شدید طور وابستہ تھے۔ بچوں سے دور رہنے کا اُن کو بہت دُکھ تھا۔ ایک بار میں لون صاحب کے ساتھ خریداری کرنے کے لئے چاندنی چوک چلا گیا۔ میں اُن کو تحفہ دینا چاہتا تھا۔ وہ کب ماننے والے تھے۔ اصرار پر اصرار کرنے کے بعد انہوں نے آخر ایک مراد آبادی ایسٹرے کا انتخاب کیا' جو چھوٹے جوتے جیسی تھی۔ یہ انتخاب اِس بات کا ثبوت تھا کہ اُنہیں کس قدر بچوں کی یاد آتی تھی۔ جِس زمانے میں لون صاحب ریڈیو کشمیر سری نگر میں بہ حیثیتِ کلرک کام کرتے تھے، موسم سرما میں کوتاہ قد گلہ بند اچکن پہنتے اور سر پر کنٹوپ ۔ وہ دوستوں کے ساتھ رائل ہوٹل جا کر چائے نوشی کرتے۔ میں اُن کے ساتھ سخت نفرت کرتا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہم ایک جان دو قالِب ہو کر رہ جائیں گے۔ لون صاحب اپنی بیٹیوں کو بیٹے سمجھ کر پالتے تھے تاہم اُن کی تمنا تھی کہ ایک بیٹا بھی ہوتا۔ اُن کی کہانی ''مونچھوں والی گُڑیا'' کا پسِ منظر اُن کی یہی تمنّا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے بروڈا میں ''نقوش'' کا سعادت حسن منٹو نمبر پڑھا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں نے منٹو کے کچھ افسانے پڑھے تھے۔ نقوش کے خصوصی نمبر کے گہرے اثر کے تحت میں نے کچھ افسانے لکھے'' دُرِ جورء (جوڑی گوشواروں کی)'' کے عنوان کے تحت میرا افسانہ کشمیری افسانوں کے ایک مجموعے میں چھپ چُکا ہے۔ جو افسانے دلی میں لکھے اُن کے پس منظر اُسی علاقے سے متعلق تھے مثلاً ''آنکھیں''۔ ''یہ پستیاں، یہ بلندیاں'' عنوان کے تحت میرا ایک افسانہ بیسویں صدی میں شائع ہو گیا' وہ امرناتھ یاترا کے پسِ منظر لکھا گیا تھا۔ ''ٹھنڈی آگ کا دُھواں'' کا

پسِ منظر کشمیر سے باہر کا تھا۔ یہی پسِ منظر ''ایک موت، ایک مُسکراہٹ'' افسانے کا ہے۔ میری ایک اور کہانی کا عنوان ہے'' دود دگ (درد اور کسک) ''۔اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ایک کُتیا ہے۔ کشمیر میں یہ کُتیا ہمارے آنگن میں ہمارے کھانا کھانے کے وقت حاضر رہا کرتی تھی۔ گھر کا ہر فرد اپنے حصے میں سے تھوڑے چاول اُس کو کھلایا کرتا تھا۔ یہ رسم ''ہوٗنہٕ میٛٹ'' کہلاتی ہے۔ میں دیر سے گھر آجاتا تھا' اس لئے میرے کھانے میں سے اپنے حصے کے انتظار میں وہیں پڑی رہتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کبھی کبھار اُس پر میرا پاؤں بھی پڑ جاتا تھا۔ ایک بار کئی روز تک یہ کُتیا نظر نہیں آئی ،کبھی کبھی کُتیا کے بھونکنے کی ایسی آواز آتی تھی گویا وہ رو رہی ہو۔ میری چاچی نے بتایا کہ یہ وہی کُتیا ہے جو کئی دنوں سے یہاں نہیں آتی ہے۔ اِس کے بچے کسی نے غائب کر دیئے ہیں۔ بے چاری بچوں کی تلاش میں سرگرداں ہے اور روتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار جب میری ماں یہ جان کر کہ کسی کا چھوٹا بچہ مر چُکا ہے، اُن کے یہاں تعزیت کیلئے جاتی تھی۔ میں اندر ہی اندر سوچتا تھا کہ بچہ مرے تو مرے، کل دوسرا پیدا ہو جائے گا۔ جب میرے اپنے بچے نے جنم لیا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ جِس ماں باپ کا بچہ مر جاتا ہے اُس پر کیا گُزرتی ہوگی۔ میں کام پر چلا جاتا تو اپنے بچے کے متعلق ہزار وسوسے میرے دل و دماغ میں گھر کر جاتے کہ کہیں وہ سیڑھی سے نہ گر جائے، کھڑکی سے نہ کود پڑے، کوئی مضر چیز نہ کھالے۔ میں فوراً ٹیکسی میں سوار ہو کر گھر چلا آتا۔ یہ سارے واقعات و خیالات جوڑ کر میں نے کہانی ''دود دگ'' لکھی۔ میری ہر کہانی کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا تھا۔ شعر زمانے کی قید سے آزاد آفاقی ہوتا ہے۔ نثر زمین و زمان کی تابع ہے۔ میری شاعری اور مُصوری ہم آہنگ تھی مگر افسانہ اُن کے ساتھ ہم آہنگ نہ تھا۔ اندر ہی اندر یہ سوچ اور حِس مجھے بے چین پا کر دیتی تھی۔ آخر کار میں نے کہانی ''پیٖؤر (لوحِ مزار)'' لکھی جو میری سوچ سے پوری

طرح ہم آہنگ تھی۔ مصوری میں خالص آ کار تلاشتے تلاشتے میں اِس نتیجے پر پہنچ گیا کہ انسانی شبیہہ کا چہرہ مٹا دیا، ہاتھ پاؤں کاٹ لیئے اور خالص آ کار اُبھارا۔ یہی میں نے متذکرہ کہانی میں بھی کیا۔ کرداروں کو نام نہیں دیئے۔ یہ کہانی بھی مختلف زبانوں میں چھپ چھپ چکی ہے۔ چند سال قبل میں نے تین اور کشمیری افسانے لکھے' پتھ' وأنی ' أنہ درأنہِ۔ یہ تینوں میری سوچ سے ہم آہنگ ہیں۔

میں ''سمندر پیاسا ہے'' ناول میں خود نریٹر ہُوں۔ میری داستانِ عشق اس میں ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اِس میں وہ واقعہ بھی ہے جب مجھ کو تھانے میں زدوکوب کیا گیا۔ قادر گاندربلی کا دبدبہ تھا، اُس نے زینہ کدل تھانے میں کہا'' جو کچھ تُو نے کیا' اس جُرم کی پاداش میں تجھ کو کٹھوعہ جیل میں بند کر دیا جائے گا۔'' بخشی غلام محمد چاہتے تھے کہ میرا اور توشہ کا مِلن ہندو مُسلم اتحاد کے ماحول کو زک نہ پہنچائے۔ وہ بھی وقت آیا جب دھوکہ دہی سے توشہ کو ورغلا کر جموں پہنچا دیا گیا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ وہاں تم کو طلاق دلوائی جائے گی۔ وہ وہاں سے اپنے بھائی نے مسوری پہنچا دی جو مسوری میں کام کرتا تھا۔ میں نے جاسوسی کر کے بہ ہزار مُشکل اُس کا ایڈرس معلوم کیا اور مسوری جا کر اُسے واپس لانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہُوں کہ عشق کیسے کیسے مُشکل کام کرواتا ہے مگر یہ بات واضح ہے کہ مقصد ایک ہوتا ہے۔ اِس بات کو مدِّ نظر رکھ کر میں نے اپنے کشمیری شعری مجموعے ''بے سوکھ روح'' کے پیشِ لفظ میں لِکھا تھا ''شِو اور شکتی، آدم اور حوا، پرکرتی اور پُرش، مرد اور عورت، نر اور مادہ کے باہمی رشتے سے نظامِ زندگی قائم ہے۔ یہ باہمی رشتہ محبت ہے۔ یہی محبت نر اور مادہ میں ایک دوسرے کی کشش پیدا کرتی ہے۔ دونوں کو ایک کر دیتی ہے۔ گو کہ روپ الگ الگ ہیں تاہم اس طرح انفرادی شعور ہمہ گیر شعور بن جاتا ہے۔ تُو اور میں کا فرق مِٹ جاتا ہے۔ تمام انسانی ذاتیں ایک ذات میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ جُز کو کل

کا روپ مِل جاتا ہے۔ سُوہَم ٗیعنی ’’میں ہوں‘‘ انسانی ذات کی اصل ہے۔ جُز سے کُل میں جمع ہونے کا یہ عمل عشق سے شروع ہو جاتا ہے۔ عاشق اور معشوق پہلے ایک دوسرے کی ظاہری شکل و صورت پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ عشق شدت اختیار کر کے جنون بن جاتا ہے۔ جنون و جدانی کیفیت پیدا کر لیتا ہے۔ عاشق اپنی ذات میں مست ہو جاتا ہے، وہ اپنے اندر محبوب کا روپ دیکھنے لگتا ہے۔ اپنے اندر وہی پا لیتا ہے جو اُس کے بیرون میں ہوتا ہے۔ اس طرح ذات میں اصل ذات پا لیتا ہے......‘‘

ناول میں نے سنتوش کی نذر کیا ہے اور یہ بات بھی اُسی کی نذر کر دی۔ سنتوش ’’وہ‘‘ سنتوش ’’میں‘‘۔ سنتوش Contentment ہے۔‘‘ میں کمار گیلری کے ویریندر کُمار کے احسانات کو ہرگز بھلا نہیں پاؤں گا۔ وہ میرے دکھ سکھ میں برابر شریک رہا۔ مُشکِل حالات میں بجائے اِس کے کہ میرا شاعرِ دروں مر جاتا‘ وہ زندہ رہا اور فلسفی بھی بن گیا۔ یہ اشعار حسبِ حال ہیں ؎

؎ شَہہ زندگی شوقٕ یہِ سِر سٕم لو ٕمے تِتھ واٰ ٕمے مِنزِلس خبر اٰسٕم کیا ٕمے

(مجھے کیا معلوم تھا کہ منزل پر پہنچ کر میرا آفتابِ شوق ڈوب جائے گا اور سانسیں تھم جائیں گی۔)

؎ دِس وجوٗ بوٗن ہیٖرٕ دارِ چھِم گمٕتیٖ

(سرتاپا میرے وجود میں دروازے اور کھڑکیاں بن گئی ہیں)

؎ بر تہٕ دارِ چھِہ یلے وجودس یِتھ

(اس وجود کے دروازے اور کھڑکیاں کُھلی ہیں)

جون 1964ء میں میرا ناول ’’سمندر پیاسا ہے‘‘ شائع ہوا تھا۔ میں 1964ء میں ایک سیاح کی حیثیت سے امرناتھ چلا گیا۔ امرناتھ کا سفر نامہ میں نے اردو میں لکھا تھا‘ جو رسالہ ’’شاخِ گُل‘‘ میں چھپ گیا۔ بہت سے دوستوں کو اکھٹے امرناتھ

جانا تھا۔اُن ہی دنوں وہاں بادل پھٹنے کے جگر دُوز حادثے میں کئی انسانی جانیں تلف ہوگئیں اور کچھ ہوٹل ڈھ کر بہہ گئے۔تو شہ نے بہت منع کیا لیکن میں اس سفر پر جانے کا ارادہ ترک نہ کر سکا۔باقی دوستوں نے خوف کے مارے پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔ میر نصر اللہ محکمہ سیاحت کے ڈائریکٹر تھے'انہوں نے اپنے محکمے کی طرف سے میرے سفر کا انتظام کروایا تھا۔موسمی حالات خراب تھے' زور کی بارش ہورہی تھی۔میں نے یہ سفر پیدل طے کیا۔ایک ادیب اور مصور کی حیثیت سے یہ سفر میرے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔پہاڑوں پر چڑھتے اُترتے گوکہ مقصد امرناتھ گپھا تک پہنچنا تھا لیکن ساتھ ہی رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ کیا واپس سری نگر پہنچنا ممکن ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں، آبشار اور برف۔ برف کا مجھے انوکھا تجربہ ہوگیا سری نگر میں رہ کر برف روئی کے بڑے بڑے گالوں کی طرح دِکھتی ہے۔ پہاڑی چوٹیوں پر اِسی برف کے مختلف النوع آکار اُبھرتے ہیں۔کئی پہاڑوں پر برف کی لکیریں گویا کِسی کاتب نے سفید روشنائی سے کھینچی ہوں۔صبح سویرے پِسو پہاڑ پر چڑھنے کی کیفیت آج تک نہیں بُھولا ہوں۔ یاتری،گھوڑے اور ڈانڈی والے ٹیڑھے میڑھے سانپ کی شکل جیسے راستے پر آہستہ آہستہ سے قدم جما کر بلندیوں کی طرف چڑھتے جاتے۔دُھند میں نظر نہ آنے پر گویا آسمانوں میں غائب ہوجاتے ہیں۔ڈانڈی والوں کی اپنی مخصوص بولی ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو ہدایات دیتے رہتے ہیں۔پِسو پہاڑ کی چوٹی پر ایک سپاٹ میدان اور میدان بوج پتر کا ایک درخت اِس درخت کے نیچے میں تھوڑی دیر سستایا۔میرے پِٹھو بیگ میں روٹیاں اور ضرورت کی چیزیں تھیں کیمرہ بھی تھا اور چائے سے بھرا تھرماس بھی۔ پھر بھی ہر جوئے آب سے اپنی پیاس بُجھاتا رہا۔ساتھ رکھی پانی کی بوتل کو کھولا تک نہیں۔ جب جھیل شِیش ناگ پر نگاہ پڑی تو نیلگوں پانی دیکھ کر گویا تھکاوٹ جاتی رہی اور بدن کے روم روم میں تازگی دوڑ گئی۔ چاند کی روشنی

اور اِس سبز رنگ کے ملن سے جو نظارہ پیدا ہوتا تھا وہ شو کے آکار کی طرف توجہ مرکوز کرواتا تھا۔ پنج ترنی کے رنگ برنگ دریا، مہا گُنس پہاڑ پر صبح کا نظارہ، اوپر چوٹی سے بہنے والا آبشار، آگے اونچا پہاڑ، اِس پار پہاڑوں کے درمیان ہزاروں فٹ گہری کھائی اور سفید برف ایسا ماحول دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ پرندے کی طرح بانہیں پھیلا کر اِس سب کا لطف اُٹھاؤں ۔ مہا گُنس کی چوٹی تک میں ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ گیا۔ وہاں سپاٹ میدان ہے جس کے دائیں بائیں پہاڑ دیوار بنائے کھڑے ہیں۔ پتھروں میں مختلف النوع پھول کِھل اُٹھے تھے۔ گپھا کے راستے میں امراوتی ندی ہے اُس کے صرف سو گز پر دھوپ پڑتی ہے۔ اِس ندی میں یاتری نہاتے ہیں ۔ یہاں سے گپھا زیادہ دُور نہیں ہے میں نے اشنان کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا حتیٰ اِس کا خیال بھی نہیں آیا تھا لیکن ایک بوڑھے یاتری کو اشنان کرتے دیکھ کر میں شرمایا اور میں نے فوراً اشنان کرلیا۔ امرناتھ سے واپسی پر میری شاعری میں تبدیلی آگئی۔ میں نے مختصر نظمیں لکھیں۔ ہالی وُڈ ہوٹل میں منعقدہ ایک ادبی محفل میں جب میں نے یہ نظمیں پڑھیں تو تمام بُزرگ شعرا بشمولِ دینا ناتھ نادمؔ صاحب یک زبان ہو کر بول اُٹھے کہ یہ نظمیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ ے

منہِ شرٗو پرأوم ہندِ ہنہِ رتۂ کوٗل
متۂ آکھ ژٕ وُچھتم پادن ہنٛدی
رادھا ووٚلۂ از زُنۂ گاش ملوَ
ووٚلۂ راس گِندو ووٚلۂ ہکٹا کرو
پمپوش زاٗنہہ کر أدرٕو پان

(میں نے خون کی ندی اپنے من میں جذب کرلی۔ میرے تلوؤں پر زخموں کے نشان نہ دیکھ اے رادھا۔ آ جا' راس کھیلیں' رقص کریں' چاندنی اپنی کایا پر مَل دیں۔

پانی میں رہ کر بھی کنول گیلا نہیں ہوتا ہے)۔

اُسی زمانے میں رادھا کرشن برار و ڈراما ''یاہُو'' کی ریہرسل کر رہے تھے۔ اِس ڈراما کے ساتھ میں بھی وابستہ تھا۔ برار و شیکسپیئر کا یہ قول Now or Never بار بار دہراتے تھے۔ کہتے ہیں کہ امرناتھ یاترا کے دوران راستے پر سنگِ میل بدل دیئے جاتے تھے تا کہ فاصلہ کم نظر آئے۔ ؎

دۄ پن سپدِن پیٚہے دمہٕ یانہ سپدِن
چھےٚ ژھوٚٹ وتھ کوسہٕ سنامیتہٕ بأوی تو کانٛہہ
ژھوچر زتچھر چھُ ماسُے نظرِ ہُنٛد سنٛگ
ژھوٹیمِژ زانٛہہ تہِ وتھ چھا میلہٕ پچہِ ٔستی

(اُس نے کہا' کوئی راستہ دکھائے جو زیادہ طویل نہ ہو۔اسی وقت ہو جائے یا کبھی نہ ہو جائے۔سنگِ میل بدلنے سے کیا راستوں کی مسافت کم ہو جاتی ہے۔ طویل مسافت اور کم مسافت کا دار و مدار نظر پر ہے کہ وہ کہاں تک ساتھ دے پاتی ہے)۔

اس زمانے میں تنگ دستی نے میرا قافیہ تنگ کیا تھا۔اللہ رزاق ہے۔تنگی اور تنگ دستی کا وہ زمانہ بھی نہ رہا۔ابتداً میں نے سانیٹ لکھے اور نظمیں لکھیں۔میرا رجحان اختصار کی طرف تھا۔مصوری میں پہلے ہی تعین کرنا پڑتا ہے کہ کس بات کا اظہار مقصود ہے۔ادب میں خاص کر نثر میں زمان و مکان کا اظہار ممکن ہے، میری تصویروں میں بھی یہی کوشش کارفر ہے۔غزل آفاقی بن جاتی ہے۔غزل کی طرف رجوع سانیٹ کے بعد اختصار کی وجہ سے ہی تھا۔ایک وقت تھا کہ شعرا کہنے لگے کہ ایک ہی غزل میں محبوب ایک ہی وقت میں مونث اور ایک ہی وقت میں مذکر نہیں ہونا چاہیے۔میں چاہتا تھا کہ میرا محبوب مونث روپ میں بیک وقت دنیاوی بھی ہو اور ماورائی بھی۔کامل

صاحب نے غزل کو نیا لب ولہجہ عطا کیا، اُس سے متعلق ''کائشر ادب'' رسالے میں بحث و تمحیث کا سلسلہ بھی چلا۔ کاملؔ صاحب کی غزل نے میرے شوقِ غزل گوئی کو بڑھاوا دیا۔

میں نے ''کائشر ادب'' رسالہ کی نئے سرے سے اشاعت اُس زمانے میں شروع کی جب کاملؔ صاحب نے ''نیب'' رسالہ شائع کر دیا۔ میں ادیبوں کے قلمی پورٹریٹ Portrait لکھنا چاہتا تھا۔ علی محمد لون اور کاملؔ صاحب سے یہ پورٹریٹ لکھنے کی التجا کی تو لون صاحب نے صاف الفاظ میں بتایا کہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ کاملؔ صاحب بھی چپ سادے بیٹھے۔ آخر میں نے مزاحیہ رنگ میں کچھ پورٹریٹ قلم بند کر کے ''خولہِ خط'' عنوان کے تحت ''کائشر ادب'' میں شائع کر دیئے۔ پہلا پورٹریٹ کاملؔ صاحب کے بارے میں تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ کاملؔ صاحب نے اپنے بارے میں پوری تفصیلات بتا دیں۔ دوست شعرا کے بعض اشعار پر میں نے پیروڈی بھی لکھی۔ مجھے افسوس ہے کہ نادمؔ صاحب مرحوم حاجنی صاحب کے ''خولہِ خطّ (خدوخال)'' نہ لکھ پایا۔ جموں میں نادمؔ صاحب سے انٹروو بھی کیا تھا لیکن وہ کاغذات نہ جانے کیونکر تلف ہو گئے۔

واکھ لل دید اور دیگر شعرا نے بھی لکھے ہیں۔ نادمؔ صاحب نے بھی مختلف انداز سے واکھ لکھے۔ میں نے تقریباً چار سو واکھ (واکھیہَ) ''واکھِ سدٕ'' کے عنوان کے تحت لکھے جو کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔ وژُن، ہماری قدیم شعری ضعف ہے، جو قدیم زمانے سے استعمال میں ہے۔ میرے خیال میں اِس صنف میں طبع آزمائی کرنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ تینوں یا چاروں مصرعوں میں قافیہ باندھنا پڑتا ہے یا مصرعوں کے اندر بھی قافیہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ راہیؔ صاحب نے کُچھ میٹھے وژن لکھے ہیں۔ میں نے از سرِ نو وژن لکھے اور کچھ مشاعروں میں بھی پڑھے۔ وژن

فارم میں تقریباً سولیلائیں لکھیں ۔ میں نے چند طویل نظمیں لکھیں، جن میں ''شکتی وبڑار'' نام کی نظم 153 بندوں پر مشتمل ہے۔

میرے اردو ناول کو ریاستی کلچرل اکیڈمی کا ایوارڈ ملا ہے۔ گلریز او پیرااور رژ ٹھ ڈرامے کو بھی انعامات ملے ۔'' بے سوکھ روح'' شعری مجموعے کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نواز گیا ہے۔

●●●

(غلام رسول سنتوش کا تخلیقی سفر ''سون ادب'' 1994-1995ء میں شائع ہُوا ہے۔ادارہ)

☆......غلام نبی خیالؔ

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

میں کب اور کہاں پیدا ہوا، یہ تو مجھے بتایا گیا ہے لیکن کیوں پیدا ہوا اُس کی مجھے کوئی علمیت نہیں۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ راجدھانی سری نگر شہر کے ''حول'' علاقے میں پیدا ہوا ہوں۔ اُن دنوں شہر میں تین درس گاہیں تعلیم و تدریس کے لئے مشہور تھیں۔ امیرا کدل کے بسکو سکول میں زیادہ تر متمول گھرانوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کرن نگر کا نیشنل سکول کشمیری پنڈتوں کے لئے مخصوص تھا اور راجوری کدل کا اسلامیہ ہائی سکول متوسط طبقے کے مسلمان طلبا کا تدریسی مرکز تھا۔ اسی اسلامیہ سکول میں میرے دادا غلام محمد میر نے میرا داخلہ کرادیا۔ یہ سکول ہمارے گھر سے مختصر فاصلے پر واقع تھا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں مجھے میر واعظ مولانا غلام نبی مبارکی، مولانا نورالدین اور محمد حسین آزاد پنجابی جیسے علمائے دہر کی رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ہمارا کنبہ محلے کا سب سے بڑا گھرانہ تھا جس کے مکینوں کی تعداد کوئی چالیس افراد پر مشتمل تھی۔

اسلامیہ ہائی سکول میں، میں نے ایک معمول کے طالبِ علم کی حیثیت سے ابتدائی تعلیم حاصل کی جس کے ساتھ کوئی یادگار واقعہ وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ موسیقی کے ایک ہفت روزہ سلسلے کی حسین یادیں اب بھی فکر و ذہن میں برجستہ گلابوں کی مہک بن کر ابھرتی ہیں۔

اُن دنوں حول کا سارا علاقہ بادام اور انار کے باغات سے بھرا پڑا تھا جس

میں کہیں کہیں اُ کا دکا رہائشی مکان نظر آتے تھے۔ بہار کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے گھر سے ملحق در باغ میں ہر اتوار کو صوفیانہ موسیقی کی محفل آراستہ ہوا کرتی۔ سبز مخملی زمین پر نقرئی چاندنی بچھائی جاتی جس پر براجمان ہو کر محمد عبداللہ تبت بقال اور ان کے ہم نوا سنگیت کا ایسا جادو جگاتے تھے کہ ہم سبھی کم عمر بچے سارا دن اس محفل سے محظوظ ہوتے ہوئے کھانا پینا تک بھول جاتے تھے۔ سنگیت کی اس محفل کے دوران جہاں ہم اور ہمارے ساتھ چھوٹی لڑکیاں سوئی دھاگہ لے کر زمین پر گرے ہوئے بادام کے شگوفوں سے مالائیں بنا بنا کر پہنتیں اور خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ وہاں ہمارے یا کسی اور صاحب ثروت ہمسایہ گھرانے سے بڑے بڑے سماواروں میں زعفرانی قہوہ لایا جاتا جس کے ساتھ گھی میں بنائی ہوئی باقر خانیوں سے بھری ٹوکریاں بھی ہوتیں۔ یہ قہوہ مہمانوں کے ساتھ بچوں کو بھی ضرور پلایا جاتا۔

تبت بقال کا یہ معمول تھا کہ وہ دن کے ڈیڑھ بجے محفل سمیٹ کر ہمارے گھر کی طرف رخ کرتے جہاں اس گھر کی بالائی منزل میں ظہر کی با جماعت نماز ادا کی جاتی۔ پھر یہ لا ثانی گلوکار اپنے گھر کی راہ لیتا جو مشکل سے ایک یا دو میل کی دوری پر بدھ گیر میں واقع تھا۔

تقریباً ساٹھ ستر سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی تبت بقال کا بار بار گایا ہوا وہ دلنشین اور اُن کا اپنا پسندیدہ نغمہ میری یادوں کے شبستان میں جاگ اٹھتا ہے جسے وہ مقام راست کشمیری میں گاتے تھے:

لیس مارہ متس مأنز چھ نمن   سہ کمن سیتین گوم
کلہ والی بورنم شراب خمن   داماہ چاوتھ گوم
سےٗ چیتھ پھیوٗرم رُمن رُمن   کمن سیتین گوم

(میرے محبوب کے ناخن مہندی سے رنگے ہیں، وہ نہ جانے کن کے ساتھ

چلا گیا۔ساقی نے میرا جام شراب سے لبریز کیا اور چند قطرے پلا کر گیا۔ یہ شراب میری نس نس میں سرایت کرگئی۔میرا محبوب کن کے ساتھ چلایا گیا؟)

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد گھر میں جو بات موضوع سخن بن گئی وہ یہ تھی کہ اب میرا اگلا قدم کیا ہوگا۔میں تو دل و جان سے تعلیم آگے جاری رکھنے کا متمنی تھا لیکن میرے ماموں میر عبدالعزیز کے مشورے پر، جن کی بات گھر میں حرفِ آخر سمجھی جاتی تھی اور جن کے سامنے سبھی افراد خانہ بھیگی بلی بن کر خاموش بیٹھے رہتے تھے، یہ طے پایا کہ مجھے اب نوکری کرنی چاہئیے ۔جب اس فیصلے پر دبے دبے لہجے میں کسی نے اختلاف کا اظہار کیا تو میر صاحب اپنی گھن گرج والی آواز میں بولے:''بہت ہو چکا، غلام نبی اب نوکری کرے گا اور اس وقت دسویں جماعت پاس ہونا ایک بڑی بات ہے،اسے فوراً سرکاری ملازمت ملے گی۔''

میں نے سن رکھا تھا کہ ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد ہر جمعہ کو صبح سے لے کر نمازِ ظہر کے وقت تک اپنے پرائیویٹ دفتر میں لوگوں کے مسائل سن کر موقع پر ہی ان کا فیصلہ سناتے تھے۔میں نے اُن سے اپنے بارے میں کہا کہ میں نے میٹرک کیا ہوا ہے اور اب نوکری کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔اُس وقت ان کے ساتھ سید نظیر احمد شاہ عرف شیام جی موجود تھے جو پولیس کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔بخشی صاحب نے شیام جی کی طرف رخ کر کے کہا:''یہ چھ فٹ کا لمبا نوجوان پولیس کے لئے موزون ہے۔اسے کل سے ہی پولیس میں بھرتی کریں اور ہاں،اسے سب انسپکٹر کا عہدہ دیں''۔شیام جی نے کورنش بجالا کر حکم کی تعمیل کا اشارہ دیا۔

میں خوشی خوشی گھر پہنچا۔ والدین یہ مژدہ سن کر خوش ہوئے لیکن میرے ماموں میر صاحب نے تیوریاں چڑھا کر حیرانی سے پوچھا:''کیا؟ کیا ہمارے خاندان کا لڑکا پولیس کی نوکری کرے گا؟ ہرگز نہیں''۔

ماموں کی رائے پتھر کی لکیر ثابت ہوئی۔ پھر گھر میں کسی نے بھولے سے بھی پولیس کا کبھی نام نہیں لیا۔

اس کے بعد زمانۂ حال تک کی میری داستانِ حیات عجیب و غریب واقعات، مدو جزر، غیر متوقع حالات اور فلمی نوع کی دلچسپ اور غم ناک کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔

ریڈیو کشمیر سری نگر میں شعبۂ موسیقی میں چند گانے والوں کی ضرورت تھی۔ مجھے روزِ اوّل سے ہی گانے بجانے کا شوق تھا۔ میں بھی ریڈیو کے دفتر پر گیا اور وہاں یہ فلمی گانا گا کر بزعمِ خود تیر مارا کہ میں منتخب ہو کے ہی رہوں گا:

محبت کے دھوکے میں کوئی نہ آئے
جو اک دن ہنسائے تو سو دن رلائے

آڈیشن چل ہی رہا تھا کہ شعبے کے سربراہ بشیر بٹ سٹوڈیو میں آئے اور مجھ سے تلخ لہجے میں کہا کہ میں فوراً باہر چلا جاؤں کیونکہ ایک تو میں نے فلمی گیت گایا اور دوسرا یہ کہ میں اس پٹے پٹائے گیت کو بھی صحیح سُر تال کے ساتھ گا نہیں سکا۔ میں بے نیل و مرام گھر لوٹ آیا۔ چند روز بعد اسی ریڈیو سٹیشن میں اردو اور کشمیری زبان میں خبریں پڑھنے کے لئے ایک نیوز ریڈر کی جگہ خالی ہوئی۔ میں پھر اس امتحان کے لئے میدان میں کود پڑا۔ امیدواروں میں میرے دو ادیب دوست امیش کول اور مکھن لال بیکس بھی شامل تھے۔ پروفیسر جیالال کول اور محمودہ احمد علی شاہ ممتحن تھے۔ میری موزون آواز اور صحیح تلفظ کی بدولت مجھے منتخب کیا گیا۔ اُس وقت میری ماہانہ تنخواہ سوا سو روپے مقرر ہوئی۔

ریڈیو کی ملازمت سے قبل میری ادبی زندگی کا آغاز دراصل 1951ء سے ہی شروع ہوا تھا جب میں شہر سری نگر کی اُس وقت کی مایہ ناز تعلیمی درس گاہ اسلامیہ ہائی

سکول میں زیر تعلیم تھا۔ میرے اختیاری مضامین میں عربی شامل تھی۔ یہ زبان کشمیر کے ایک ممتاز عالم دین اور سکالر مرحوم مولانا غلام نبی مبارکی ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مبارکی صاحب ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میری دلچسپی شاعری کے اوزان اور ردیف وقافیہ کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس طرح سے میں نے 1952ء میں اردو میں پہلی غزل لکھی جو جالندھر پنجاب کے ایک رسالہ 'راہی' میں شائع ہوئی۔

ان ہی دنوں میرے ایک ہم جماعت نے دہلی کے مشہور فلمی رسالے ''چترا ویکلی'' کے مطالعہ کا شوق مجھ میں پیدا کیا اور میں ہر ہفتے یہ رسالہ امیرا کدل کے اومکار برادرس بک شاپ سے خرید کر گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھتا رہا کیونکہ ہمارے گھر میں فلموں سے متعلق باتیں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر مجھ میں اردو افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اُس دوران میں نے جو درجنوں افسانے لکھے وہ اسی ''چترا ویکلی'' میں جی۔ این۔ برسات، شہباز کشمیری اور صادق رضوانی کے قلمی ناموں سے شائع ہوئے۔

یہاں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ جب میں نے اپنا اوّلین اردو افسانہ لکھا تو ان دونوں مرحوم پیر عبدالاحد سری نگر میں اخبار ''الحق'' کے ایڈیٹر تھے۔ لال چوک میں مرحوم غلام محمد صادق اور مرحوم خواجہ غلام محی الدین قرہ کی بیٹھک میں اس اخبار کا بھی دفتر تھا۔ ایک روز میں سہما سہما پیر صاحب کے پاس گیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ میرا یہ افسانہ شائع کریں۔ اخبار کے اگلے شمارے میں افسانہ شائع تو ہوا لیکن کاتب نے اسے نامکمل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح سے افسانے کا اختتام جسے ہم ان دنوں فلمی اصطلاح میں The End کہا کرتے تھے، اشاعت سے رہ گیا تھا۔ میں پھر پیر صاحب کے پاس گیا اور اس طرف ان کی توجہ دلا کر ان سے التجا کی کہ افسانے کا اختتامی حصہ بھی چھاپ دیں تا کہ پوری تحریر پڑھنے والوں کے سامنے

آ سکے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے، ضروری نہیں ہے کہ کسی افسانے کا اختتام بھی ہو۔ آپ کا افسانہ میں نے چھپنے کے بعد پڑھا ہے اور یہ مجھے The End کے بغیر زیادہ اچھا لگا ہے۔

میرا اردو افسانہ نگاری کا شوق پھر بھی قائم رہا البتہ میرے یہ فلمی ٹائپ کے افسانے سوائے ''چترا ویکلی'' کے اور کوئی اخبار یا رسالہ شائع کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوا۔ یہاں پر یہ بھی کہہ دوں کہ اس مقبولِ عام رسالے میں ہر ہفتے اس کے مستقل قارئین کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ اوّلین خط بغیر کسی ناغہ کے قلوپطرہ نامی کسی پُر اسرار نسوانی شخصیت کی طرف سے ہوتا جس کا اتا پتہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کشمیر کے چترا پریمیوں میں باقاعدہ مراسلہ نگاروں میں لیکھ راج چھاپڑہ، حسن شش و پنج، حسن ساہو اور ہمدم کشمیری شامل تھے۔

اُس زمانے میں وہ دن میری دلی مسرت اور ذہنی آسودگی کا ایک عظیم دن تھا جب اسلامیہ ہائی سکول کے وسیع و عریض ہال میں ایک مشاعرے میں پہلی بار شرکت کر کے میں نے ایک کشمیری نظم پڑھی۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ انجام دے رہے تھے اور اس مشاعرے میں موجود میرے استاد مولانا مبارکی دل کھول کر مجھے داد دے رہے تھے۔ کشمیری، اردو اور فارسی زبانوں میں منعقدہ اس محفلِ سخن میں محمد امین دار آبؔ، مرزا کمال الدین شیداؔ، خوشباشؔ کشمیری، مبارک شاہ فطرت گیلانی، پروفیسر نندلال طالبؔ، غلام نبی عارضؔ اور فاضلؔ کشمیری کے علاوہ مولانا مبارکی نے بھی شرکت کی جنھوں نے دلوں کو چھو لینے والی اور آنکھوں کو اشک بار کرنے والی ایک نعت شریف اردو میں سنائی۔

جہاں مولانا مبارکی نے ذہنی طور پر مجھے سخن گوئی کی طرف مائل کیا وہیں پہلے پہلے رحمٰن راہیؔ میری کشمیری نظموں اور غزلوں کی اصلاح کرتے رہے اور اس مناسبت

سے میں انھیں بھی اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔

اپریل 1954ء میں، میں ریڈیو کشمیر سری نگر میں اناؤنسر اور نیوز ریڈر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا جہاں مجھے ڈیڑھ سو روپے مشاہرہ کے عوض یہ ملازمت مل گئی۔ سری نگر کے ریڈیو سٹیشن میں اُن دنوں کئی ادیب، شاعر اور ڈراما نگار موجود تھے جن میں سہیلؔ عظیم آبادی، پریم ناتھ پردیسی، غلام رسول نازکی، عبدالحق برقؔ، غلام حسن اعجازؔ، پران کشور، علی محمد لون، اکبر لداخی، پشکر بھان، قیصر قلندر، وی۔ ایس۔ این کیمفر، کنول نین پرواؔز اور شفیع شفائی قابل ذکر ہیں۔ انہی میں سے چند ایک مقامی حضرات کی ترغیب اور وساطت سے میں نے ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کشمیر کلچرل کانفرنس کی ہفت روزہ ادبی نشستوں میں باقاعدہ شرکت کرنا شروع کیا۔

مجھے مولانا محمد سعید مسعودی جیسے سربرآوردہ مفکر اور عالم سے علمی اور ادبی استفادہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا دن رات محوِ مطالعہ رہتے تھے اور اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں جو عام طور پر انھیں شیخ صاحب کی ایک زبردست حامی مس مردولا سارابائی نئی دہلی سے باقاعدگی کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔

مجھے فارسی زبان سیکھنے کا شوق ہوا اور میری یہ خواہش مولانا اور حسام الدین بانڈے کی عنایات سے پوری ہوئی۔ مولانا کے پاس مولانا عبدالسلام ندوی کا مرتب کردہ عمر خیاؔم کی رباعیات کا ایک نسخہ تھا جو تقریباً ایک سال کے عرصے میں، میں نے عمر خیاؔم کی ڈیڑھ سو رباعیات کا منظوم کشمیری ترجمہ مکمل کر لیا اور بعد میں 1961ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آ گیا۔ اس ترجمے کے آغاز میں میرا موزون کیا ہوا یہ طبع زاد فارسی قطعہ بھی شامل ہے:

نغمہ عشرت ، فغان غم ، حدیثِ سوز و ساز
اہل دل را تحفہ ارباب حال آوردہ ام
نوش کن تا راز ہائے بستہ گردند آشکار
بادۂ خیامِ در جام خیال آوردہ ام

ترجمۂ رُباعیات عمر خیامؔ میری آج تک کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب ہے۔

مجھے سعدیؔ، حافظؔ، جامیؔ اور اقبالؔ کا فارسی کلام پڑھنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔

1960ء کے دوران میں نے کشمیری میں کئی غزلیں اور نظمیں تخلیق کیں۔ یہ کلام ایک مجموعہ کی صورت میں 1963ء میں ''زنجورہ ہندساز'' (سازِ زنجیر) کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میری شاعری پر فیض احمد فیضؔ، ناظم حکمت اور قاضی نذرالاسلام کا اثر رہا ہے۔ میں نے جن مصنفوں اور ادیبوں کی تخلیقات کا ذوق وشوق سے مطالعہ کیا ان میں جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزادؔ، فیض احمد فیضؔ، قاضی نذرالاسلام، جولیس فیوچک وغیرہ شامل ہیں۔

1962ء میں ارسطو کی مشہور تنقیدی کتاب بوطیقا(Poetics) کا میرا کشمیری ترجمہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس کاوش کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ادبی تنقید کی اس قدیم ترین کتاب کو کشمیری میں منتقل کر کے اہلِ کشمیر کو اس کی اہمیت اور افادیت سے روشناس کریا جاسکے۔

بخشی صاحب تک نہ جانے کن خاص ذرائع سے یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ میں نے عمر خیامؔ کی فارسی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک روز انھوں نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری آر۔ سی ۔ رینہ کے ہاتھ مجھے فوری طور ملنے کا پیغام بھیجا۔ اس ملاقات میں بخشی صاحب نے میری اس کاوش پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ کیونکہ

امریکی صحافی روزن تھال کے بقول جہاں شیخ عبداللہ، اقبالؔ کو چاہتے تھے وہیں بخشی غلام محمد کا پسندیدہ شاعر عمر خیامؔ تھا۔

بخشی صاحب نے مجھے پانچ سو روپے دیئے اور کہا کہ یہ ترجمہ فوراً کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیئے۔ جب اس کتاب کی پانچ سو کاپیاں شائع ہوئیں تو پانچ سو روپے میں سے ڈیڑھ سو روپے بچ گئے تھے۔ میں یہاں پر بخشی غلام محمد کی اس ادائے دلبری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا:

وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

اس کے ساتھ ہی بخشی صاحب نے مجھے کلچرل اکیڈمی میں ملازمت بھی دلوائی جہاں اختر محی الدین اور امین کاملؔ پہلے سے ملازم تھے۔ میں چار سال تک مرزا کمال الدین شیداؔ، صاحبزادہ حسن شاہ، علی جواد زیدی اور پروفیسر جیالال کول کی ماتحتی میں اکیڈمی کے شعبۂ مطبوعات کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور ان احباب کی شفقت اور دوستی سے قدم قدم پر فیض یاب ہوتا رہا۔ اکیڈمی میں، میں نے اپنا سارا وقت کشمیری زبان اور ادب کی تحقیق و تدوین میں صرف کیا جس کا ماحصل محمودؔ گامی، لکشمن کول بلبلؔ اور اکہٕ نندٕنؔ پر میری تحقیقی مطبوعات کی شکل میں نمودار ہوا۔ اکیڈمی کے لئے میں نے سمترا نندن پنتؔ کی ہندی نظموں کے ترجمہ کی بھی شیرازہ بندی اور ''سون ادب'' (کشمیری) کی ترتیب کے علاوہ اوتار کشن رہبرؔ کی معیت میں کشمیری زبان کی تاریخ کو بھی مرتب کر کے شائع کروایا۔ اس دوران ''لولکُ پرتو'' کے بعد میری کشمیری غزلوں اور نظموں کا ایک اور مجموعہ ''پراگاش'' (نورِ سحر) کے نام سے منظر عام پر آ چکا تھا۔ یہاں میری ماہانہ تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی۔ اکیڈمی کی ملازمت بھی مجھے راس نہ آئی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ میرے قاری کی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

1965ء میں، میں نے کشمیری زبان کا پہلا اخبار ہفت روزہ ''وطن'' کے نام سے شروع کیا جس کا ایک سو صفحات پر مشتمل ''امن نمبر'' آج بھی کشمیری صحافت میں ایک یادگار اور لاثانی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خاص نمبر ستمبر 1965ء کی ہندو پاک جنگ کے ساتھ ہی شائع ہوا اور اس کے لئے عالمی شہرت یافتہ ممتاز فلسفہ دان برٹرینڈ رسل نے مجھے خصوصی طور پر اپنا وہ پیغام لندن سے ارسال کیا۔اس سے قبل اگرچہ مہجورؔ نے 1940ء میں ''گاش'' نامی ایک دوورقی کشمیری اخبار کا آغاز کیا تھا لیکن اس کے صرف تین شمارے ہی شائع ہو سکے لہٰذا اسے اس زبان کے باقاعدہ اخباروں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔''وطن'' کشمیری ادیبوں اور قلم کاروں کی بے حسی کے باعث 1968ء میں دم توڑ گیا۔

میرا اردو روزنامہ ''اقبال'' بھی 1968ء سے لے کر 1977ء تک سری نگر سے شائع ہوتا رہا لیکن اس دوران انگریزی صحافت کی طرف رجوع کرنے کی بنا پر یہ اخبار بھی بالآخر بند ہوا۔

دیگر صحافتی اداروں کے لئے کام جاری رکھنے کا سلسلہ ترک کئے جانے کے بعد میں نے مئی 2003ء میں انگریزی ہفت روزہ اخبار Voice of Kashmir جاری کیا جو اب تک ہر جمعہ کو باقاعدگی سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

1972ء میں 512 صفحات پر مشتمل میری ضخیم کشمیری کتاب ''گاشری منار'' (روشنی کے مینار) منظر عام پر آ گئی جسے 1974ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی نے بہترین کتاب کی حیثیت سے پہلا انعام دیا اور 1975ء میں اس تصنیف کو ساہتیہ اکیڈمی نے گزشتہ تین سال کے دوران شائع شدہ بہترین کشمیری کتاب قرار دے کر اعزاز سے نوازا۔''گاشری منار'' میری عرق ریزی اور تحقیق و تلاش کا نتیجہ ہے جس میں دنیا بھر کے گیارہ منتخب شاعروں پر سوانحی اور تجزیاتی مقالات درج ہیں۔ان عظیم

سخن وروں میں ہومر (یونانی)،ورجل (لاطینی)، کالی داس (سنسکرت)، ڈانتے (اطالوی)،امراالقیس (عربی)،حافظ شیرازی (فارسی)،گوئٹے (جرمن)،پشکن (روسی)،شیکسپیئر (انگریزی)، ٹیگور (بنگالی) اوراقبال (اردو) شامل ہیں۔ کتاب کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ کشمیری پڑھنے والوں کے ذہن وشعور کو دنیائے ادب کے ان نورانی میناروں کی روشنی سے منور کیا جاسکے۔ عالمی شہرت یافتہ گیارہ شاعروں سے متعلق یہ کتاب مکمل کرنے میں مجھے پورے گیارہ سال لگے۔

اس وقت تک میری کشمیری، اردو اور انگریزی تصانیف کی تعداد بتیس تک پہنچی ہے۔ میری نظروں میں انسانی زندگی صبحِ بہار کی ایک ایسی مشک بارسر خوشی ہے جو سدا لہراتی اور گرد و پیش کو اپنی ابدیت کے روح پرور اثر سے شاداں اور خشندہ رکھتی ہے۔ زندگی جاودانی ہے،اس کے برعکس موت ایک بن برسات کی بجلی ہے جو کڑکتی تو ہے لیکن برستی نہیں۔ اس کی آمد کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، اگر آئے بھی تو اس کے بعد اس کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ موت کا تصور محض ایک وہم کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے برعکس زندگی امر ہےاورحیات لازوال ہے۔

اپنی عمر کے اس آخری پڑاؤ پر میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

●●●

(خیال صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ کے خصوصی شمارہ ''غلام نبی خیال نمبر'' سے ماخوذ ہے، جو 2019 میں شائع ہوا ہے۔ خیال صاحب کا انتقال 15 اکتوبر 2023ء کو ہوا۔ ادارہ)

☆......عبدالغنی شیخ

منزل کی جستجو ہے تو جاری رہے سفر

میری تاریخِ پیدائش سکول ریکارڈ کے مطابق ۵/ مارچ ۱۹۳۶ء ہے۔
میرے دادا محمد شیخ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کشمیر سے لداخ آئے اور لیہہ میں بس گئے تھے۔ وہ سرینگر کے گُرگڑی محلّہ میں رہتے تھے اور تجارت کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔ انہوں نے لیہہ میں مریم نام کی ایک خاتون سے شادی کی، جن کی والدہ ایک نومسلم بودھ خاتون تھیں۔ دادا لداخ میں خاچے ماما کے نام سے مشہور ہوئے۔ خاچے کشمیری کو کہتے ہیں۔ ماما محمد کا مخفف ہے۔ ان کے متعلق لداخ میں ایک کہاوت ہے جس کے باعث آج بھی ہمارے خاندان کو خاچے ماما کہا جاتا ہے۔

کہاوت یہ ہے۔ تم تم تماشا خاچے ماماشا

ریپ جے پولا مانے زامی شیس، چا لقوما نے تھُونگ مے شیس

اس کا مطلب یہ ہے۔ 'واہ، خاچے ماما کیا خوب آدمی ہے۔ یہ ہمیشہ پلاؤ رام چکور کے گوشت کے ساتھ کھاتا ہے اور سدا بہترین چائے پیتا ہے۔ محمد شیخ مادی طور مرفع الحال تھے۔ وہ یہ دو جملے کسی سے کہلوانا پسند کرتے تھے اور اسے ان کی انا کو تسکین ملتی تھی۔ لداخ سکالر جوزف گیرگن اور موراوین مشن کے پادری والٹر اسبو نے اپنی کتاب میں اسے ایک ہزار لداخی کہاوتوں میں شامل کیا ہے۔ اوّل الذکر نے یہ کہاوتیں جمع کی تھیں اور والٹر اسبو نے اِن کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کے مطابق کہاوت ایک ایسے آدمی کی عکاسی کرتی ہے جو فضول خرچ ہے اور اپنی امارت کا اظہار

کرتا ہے۔

میرے دادا محمد شیخ نے لمبی عمر نہیں پائی۔ ان کے انتقال کے وقت میرے والد کی عمر چھ سال تھی۔ ان کی تین بہنیں تھیں۔ کوئی سرپرست نہیں تھا۔ اس لئے والد صاحب کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی پنجابی تاجر کو قرضہ کی رقم واجب الادا تھی لیکن ادا نہیں کر پایا۔ اس لئے رہائشی مکان کی قرقی ہوئی۔ والد مرحوم زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ غالباً انہوں نے چوتھی یا پانچویں جماعت تک پڑھا تھا۔ وہ اردو پڑھ لکھ لیتے تھے۔ کم سنی میں باپ کا سایہ اٹھ جانے سے گھر کا سارا بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا۔ والدہ بالکل ناخواندہ تھیں۔ وہ شام کو جب چراغ روشن کرتیں تو بلا ناغہ یہ دعا پڑھتی تھیں اللہ رَبی محمد نبی والاسلام الدین یعنی اللہ میرا رب ہے۔ محمدؐ نبی اور میرا دین اسلام ہے۔ والدہ کو یہ دعا والد نے سکھائی تھی اور بتایا تھا کہ مرنے کے بعد قبر میں نکیر و منکر پہلا سوال یہیں کریں گے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ اگر غلط جواب دیا تو غضب ہوگا۔

والد صاحب بازار میں ایک چار پائی پر گرمیوں میں خوبانی اور سیب بیچتے تھے۔ سردیوں میں سوکھے پھل جیسے سوکھی خوبانی، گری، اخروٹ وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ گرمیوں میں جب چینی ترکستان سے تجارتی کارواں پہنچتے تو نسوار اور ہلاس بھی فروخت کرتے تھے اور آمدن میں قدرے اضافہ ہوتا تھا۔ عموماً ایک مزدور کی طرح روز کی آمدن پر ہماری گزر بسر ہوتی تھی اور دوسرے روز کے گزارے کے لئے دوسرے روز کی کمائی پر انحصار رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ مشکل حالات میں والدہ کے سونے کا زیور چالیس روپے میں گروی رکھنا پڑا۔ گروی کی رقم ادا نہ کر پانے پر زیور واپس حاصل نہیں کر پایا۔ ایک اور مرتبہ میرے وظیفہ کے دس یا پندرہ روپے بہت کام آئے۔ تب یہ بڑی رقم تھی۔ والد مرحوم زندگی کے آخری چند سال لیہہ جامع مسجد کے موذّن رہے۔

میری تعلیم لیہہ کے واحد سرکاری لوور ہائی سکول میں ہوئی۔ پڑھائی میں اچھا

تھا۔امتحان میں اپنی جماعت میں اوّل یا دوم آتا تھا۔البتہ کھیل میں پیچھے تھا۔میرے ہم جماعت لڑکے Acrobatic اور Somersault یعنی جسمانی کرتب اور قلا بازی میں دلچسپی لیتے تھے۔مجھے گھبراہٹ اور جھجک ہوتی تھی۔البتہ فٹ بال اور تیرا کی کا شائق تھا۔کئی لحاظ سے میں بزدل تھا۔لیہہ میں ہر سال ستورلوق نام کا تہوار منایا جاتا ہے۔اس موقع پر لیہہ کے مضافات میں بدی کی علامت کے طور انسانی شکل کے ایک پتلے پر گولیاں چلائی جاتی تھیں۔آغاز میں توپ کے گولے داغے جاتے تھے۔جب تک توپ کے گولے نہیں داغے جاتے، میں جائے مقام پر نہیں جاتا تھا۔میرے سارے ہم جماعت میلہ دیکھنے جاتے تھے۔حتیٰ کہ بندوق کی آواز سے بھی میں گھبرا جاتا تھا۔اب گولیاں چلانے اور توپ کے گولے داغنے کی رسم ختم کی گئی ہے۔گولیاں چلانے کی شروعات لداخ کے ایک انگریز منتظم اعلیٰ ولیم جانسن نے انیسویں صدی میں کی تھی۔

ان دنوں اکثر گھروں میں غسل خانہ نہیں ہوتا تھا۔ہم گھر میں ایک ٹب میں نہاتے تھے۔گرمیوں میں نالے پر نہانے جاتے تھے۔تب نالے کا پانی صاف ہوتا تھا۔

لیہہ اسکول میں دوران تعلیم مجھے علم وادب میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ان دنوں بچوں کا ایک رسالہ ''رتن'' لیہہ آتا تھا۔یہ میرا پسندیدہ رسالہ تھا۔یہ جموں میں چھپتا تھا۔ہم بے تابی سے اس کا انتظار کرتے تھے۔بچوں کا ایک اور رسالہ ''پیام تعلیم'' بھی نکلتا تھا۔اسکول میں غالباً کوئی لائبریری نہیں تھی۔کم سے کم میں نے کوئی کتاب نہیں دیکھی۔لیکن چند اخبارات سرینگر سے ضرور آتے تھے، جو کافی دنوں کے بعد لیہہ پہنچتے تھے۔کبھی کبھار کسی سے اکا دکا کتاب پڑھنے کے لئے مل جاتی تھی۔لیہہ میں ایک گھرانے میں ایک چھوٹی موٹی لائبریری تھی۔ مالک کا نام شمس الدین خان تھا۔

صادق حسین سردھنوی وغیرہ کے اسلامی ناول وہاں دستیاب تھے۔ میں بلا واسطہ کسی واقف کار کی وساطت سے یہ ناول مستعار لے کر پڑھتا تھا۔ ''بانگِ درا'' میری پسندیدہ کتاب تھی۔لیکن بچوں کی نظمیں ہی ٹھیک طرح سے سمجھ آتی تھیں۔ میں نے اسی عمر میں اپنے سے چند بڑوں کو علامہ اقبالؒ کا نام بڑے احترام سے لیتے اوران کے کلام پر سر دھنتے دیکھا ہے۔تب علامہ کو رحلت ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔

سکول کی تعلیم کے دوران پہلی دفعہ ''پیامِ تعلیم'' میں میرا ایک لطیفہ چھپا۔ ساتویں جماعت میں کئی نظمیں لکھیں۔ان نظموں میں ردیف وقافیہ کا خیال بھی رکھا۔ لغت سے الفاظ کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اشعار کو مقفیٰ بنانے کی کوشش کرتا اور ہم جماعت ساتھیوں کو سناتا۔اس طرح میری نظموں کا چرچا ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ نظموں کے بارے میں اساتذہ کو بھی معلوم ہوا۔لیکن چند سال کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ ان نظموں میں پند ونصائح زیادہ ہیں، جو مجھے اچھا نہیں لگا اور پھر میں نے اس نوٹ بک کو پھاڑ ڈالا۔

ان دنوں ماہنامہ ''آج کل'' میں ''بچوں کا آج کل'' کے نام سے ایک ضمیمہ چھپتا تھا۔ جوشؔ ملیح آبادی رسالہ کے مدیر تھے۔ میں نے اپنے ہم جماعت عبدالحکیم کے ساتھ مل کر ایک کہانی لکھ کر اشاعت کے لئے بھیجی اور خط میں ہم نے جوشؔ صاحب سے درخواست کی کہ کہانی میں تذکیر وتانیث یا صرف ونحو کی غلطیاں ہوں تو انہیں درست فرمادیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا اور نہ کہانی چھپی۔

۱۹۵۱ء میں لوئر ہائی سکول لیہہ کو میٹرک کا درجہ دیا گیا۔تب ہم نے نویں جماعت پاس کی تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔ آگے پڑھنے کے لئے سرینگر جانا کم سے کم میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

میں دسویں جماعت میں سیکنڈ ڈویژن سے پاس ہوا۔ میرے کئی ہم

جماعت آگے پڑھنے کے لئے سرینگر گئے۔ میں نے عارضی طور پر ڈیڑھ ماہ بطور کلرک کام کیا۔ پھر ویٹرنری سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ کے لئے سرینگر آ گیا۔ دراصل کشمیر دیکھنے کا تجسس تھا۔ تب میٹرک پاس امیدوار لیہہ میں استاد یا کلرک تقرر ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ تب لیہہ سرینگر کے درمیان سڑک نہیں تھی اور سرینگر تک لیہہ سے پیدل یا گھوڑے پر پندرہ سولہ روز کا سفر تھا۔ لیہہ سے کئی پڑاؤ تک میں نے گھوڑے پر سفر کیا اور پھر پیدل چلا۔ سرینگر پہنچا تو جیب میں ڈیڑھ دو روپے بچے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ پلیڈیم میں ایک فلم ''دوپٹہ'' لگی تھی۔ میں نے فلم دیکھی۔ رات ایک مسجد کے حمام میں گزاری۔ صبح ایک ڈھابا میں ناشتہ کے لئے گیا۔ چائے اور روٹی کھانے سے پہلے دام پوچھے کیوں کہ جیب میں کم پیسے تھے۔ پھر ویٹرنری دفتر گیا اور ہوسٹل میں داخلہ ملا۔ تقریباً تین ماہ تک وظیفہ نہیں ملا۔ اس دوران کشمیری ساتھیوں نے مالی طور مدد کی۔ وظیفہ ملنے پر میں نے قرضہ ادا کیا۔ ہوسٹل میں ٹھیک طرح سے پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ہمارا باورچی چہرہ دیکھ کر پلیٹ میں کھانا اور سبزی ڈالتا تھا اور میرے مقدر میں کم ہی کھانا لکھا تھا۔ انہی دنوں کالج میں زیر تعلیم میرے چند لداخی دوست بھی لگ بھگ ایسے ہی تجربات سے گزر رہے تھے۔ شکم پُری کے لئے مٹر جسے کشمیری میں مٹھی کہا جاتا ہے، کھاتا تھا۔ کھانے کیلئے فالتو پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ گھر سے پیسہ آنے کی امید نہیں تھی۔ مٹر کھانے سے میرا معدہ خراب ہوا۔ اسے مجھے لمبی مدت تک معدے کی تیزابیت کی شکایت رہی ہے۔ سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ میں تحریری طور پر اول آیا، تاہم عملی طور پر بڑا پیچھے تھا۔ قوی ہیکل جانوروں کو علاج کے لئے گرانا اور دوائی پلانا میرے لئے مشکل تھا۔

سرینگر میں مجھے اچھا Exposure ملا۔ اخبار پڑھنے کے لئے میں اکثر لائبریری جاتا تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کی لیاقت بڑھاتا تھا۔ ان دنوں

سرینگر میں ایک سے زیادہ ادبی تنظیمیں تھیں۔ میں ان ادبی مجلسوں میں جانے لگا۔ وہاں میری ملاقات برج پریمی اور حسرت گڈھا سے ہوئی۔ کشمیری زبان وادب کے سرکردہ ادیب پروفیسر رحمٰن راہی ہم سے سینئر تھے۔ بعد میں برج پریمی نے کشمیر یونیورسٹی میں بطور لیکچرار جوائن کیا اور حسرت گڈھا کی تقرری کلچرل اکیڈمی میں ہوئی۔ ایک روز میں نے رحمٰن راہی کی صدارت میں ایک کہانی سنائی۔ اس کہانی کو رحمان راہی نے سراہا اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ میں مشاعروں میں بھی جاتا تھا۔ ایک مشاعرے میں سردار جعفری کے طرزِ بیان اور گھن گرج والی آواز سے بڑا متاثر ہوا۔

سرینگر میں ہی میں نے پرائیویٹ طور آگے پڑھنے اور گریجویشن کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے مجھے اردو میں ادیب فاضل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ادیب فاضل کی کتابوں کی فہرست اپنے ساتھ لیہہ لی۔ ۱۹۵۴ء میں ایک سال بعد لیہہ لوٹا۔ اگر چہ میں نے کرایہ پر ایک گھوڑا لیا تھا لیکن میرے ساتھ ایک صندوق تھا۔ اس وجہ سے میں سواری نہیں کر سکا۔ لیہہ میں سامان رکھنے کے لئے صندوق عام دستیاب نہیں تھا۔

لیہہ ویٹرنری ہسپتال میں ڈاکٹر نہیں تھا۔ میں نے بطور انچارج کام کیا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے ویٹرنری فارم مُرچے میں بطور منیجر تبدیل کیا گیا۔ یہاں بھی میں زیادہ دیر ٹِک نہیں سکا۔ کیونکہ مویشی معینہ سکیل کے مطابق گھاس اور چارہ نہیں کھاتے تھے۔ اسٹاک جمع ہوتا گیا اور ٹھیکہ دار کی طرف سے گھاس چارہ کی فراہمی میں کمی آئی۔ میرا افسر چراغ پا ہوا۔ وہ مجھے اکثر سرزنش کرتا تھا۔ مجھے فارم کے لئے نااہل اور نالائق قرار دیا گیا۔ دراصل افسر کو گھاس اور چارہ سے فاضل آمدنی تھی۔ پھر نیا افسر آیا۔ اس نے جمع شدہ گھاس فروخت کی۔ مجھے ساٹھ روپے دیئے اور خود چار سو روپے رکھ لئے۔ یہ ان دنوں بڑی رقم تھی اور مجھے فارم سے تبدیل کیا۔

اس دوران میرا ادبی ذوق برقرار تھا اور میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ لیہہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایلی ایز رجولدن بطور قلم کار میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور کبھی مجھے سکول مدعو کرتے تھے۔ اسکول کی ایک مجلس میں میں نے اپنی دو کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔ ۱۹۵۷ء میں اسکول کی لڑکیوں کے لئے ''جھانسی کی رانی'' نام کا ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ سٹیج کیا گیا اور ایلی ایز رجولدن نے سراہا۔ میں نے سکول میں ایک کہانی بھی پڑھی۔

۱۹۵۷ء میں سرینگر جا کر ادیب فاضل کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ مخمور حسین بدخشی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی ادیب فاضل کا امتحان دے رہے تھے۔ مخمور حسین کہانی کار تھے۔ ان کی کہانیاں ''بیسویں صدی'' میں چھپنے لگیں۔ خوشتر گرامی 'بیسویں صدی' کے مدیر تھے۔ انہی دنوں میری ایک یا دو کہانیاں انہوں نے مسترد کیں۔ مخمور بعد میں پروفیسر بنے۔ سرینگر میں پشکر ناتھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ پشکر ناتھ نے کہانی کار کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا تھا۔

لیہہ میں نیشنل ڈرامٹیک کلب کے نام سے چند شایقین لوگوں کی تفریح کے لئے ڈرامے دکھانے لگے۔ تب لیہہ میں تفریح کا سامان بہت کم تھا۔ میں نے بھی ڈرامے میں حصہ لیا۔ اسے پہلے میں نے چائلڈ ایکٹر کے طور دو تین ڈراموں میں کام کیا تھا۔ ایک ڈرامہ میں بطور سائیڈ ہیرو کام کیا۔ میں اعلانات بھی کرتا تھا جو آگے جا کر لیہہ میں تقریبات میں خاص کر اردو میں کمینٹیری دینا اور مشاعروں میں نظامت کا فریضہ سرانجام دینے کا پیش خیمہ تھا۔

محکمہ ویٹرنری میرے مزاج کو راس نہیں آ رہا تھا اور اسے خیر باد کہنا چاہتا تھا۔ لیکن محکمہ کے ساتھ ہوئے اقرار نامے کے مطابق پانچ سال سے پہلے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اسی اثنا میں مجھے اور کمپاؤنڈر احمد خان کو ہند۔ تبت کی سرحد پر واقع سرحدی گاؤں

چھوشول تبدیل کیا گیا۔اس زمانے میں سہولیت کے بغیر ایک کم تنخواہ ملازم کے لئے دور افتادہ گاؤں جانا آسان نہیں تھا۔حکومت ہند کا ایک ماہر سردار اوتار سنگھ پشمینہ بکریوں کی افزائش چاہتا تھا جو اس علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ہم نے جانے سے معذوری کا اظہار کیا اور ہم دونوں کو معطل کیا گیا۔ہمیں بنیادی تنخواہ بھی نہیں دی گئی جو معطل شدہ ملازم کو دی جاتی ہے۔ میں نے ٹیوشن کیا اور ایک جانکار آدمی کے ہمراہ موتی اور فیروزہ بیچنے پیادہ پا علاقہ لائن گیا۔ڈھائی ماہ بعد ہم بحال ہوئے۔معیاد پورا ہونے پر میرا استعفیٰ منظور نہیں ہوا۔ چنانچہ سرینگر جاکر ویٹرنری ڈائریکٹر سے دستی استعفیٰ کی منظوری لے کر لوٹا۔اسی اثنا میں، میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۵۸ء میں سرینگر سے نکلنے والا ماہنامہ ''دیش'' میں میری پہلی کہانی ''لوسر اور آنسو'' چھپی۔اسی سال ''دیش'' سرینگر میں ''نوری'' اور ماہنامہ ''پمپوش'' دہلی میں ''آرزوئیں'' کے عنوان سے کہانیاں چھپیں۔تب میری کہانیوں کا محور صرف لداخ تھا۔کہانیاں اور مضامین کے علاوہ میں نے نظمیں بھی لکھیں اور تخلص ''کمال لداخی'' رکھا۔لیکن میری نظمیں تک بندی تک ہی محدود تھیں۔ بعد میں لیہہ میں کئی اردو مشاعروں میں اپنی نظمیں پڑھیں۔میرے اور دوسرے لداخی اردو شعرا کے بھی اشعار معیاری نہیں تھے اور بیرون لداخ کے مشاعروں میں پیش نہیں کئے جاسکتے تھے اور نہ کسی رسالے میں چھپنے کے قابل تھے۔

۱۹۵۸ء میں لوئر ہائی سکول تینگ موگا نگ میں میرا تقرر بطور ہیڈ ماسٹر ہوا۔ محکمہ تعلیم میرے میلان اور مزاج کے مطابق تھا۔میں نے اپنی دانست اور محنت سے سکول میں مثبت تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔تعلیم و تدریس کے علاوہ کھیل کود اور ڈرامہ جیسی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔تنگ موگا نگ علاقے کا مرکزی گاؤں تھا۔علاقے کے دیہی پرائمری سکولوں سے بچے چھٹی جماعت داخلہ کے لئے تنگ موگا نگ آتے

تھے۔ بچوں کا رول بڑھانے کے لئے ہم نے کئی گاؤں کا دورہ کیا۔ ڈرامے اور کھیل کود دکھائے، جس کا مثبت نتیجہ نکلا۔ ہم نے لیہہ میں بھی ایک ڈرامہ دکھایا، جسے لوگوں نے پسند کیا اور کئی ہزار روپے انعامات ملے۔ ان دنوں لداخ کے تمام سکولوں کے طلبا کو آٹھویں جماعت کا امتحان اجتماعی طور دینا پڑتا تھا۔ لیہہ اور کرگل امتحانی مراکز تھے۔ تنگ موگانگ کا ایک طالب علم اول اور دوسرا سوئم آیا۔

مجھے پیدل چلنے کی عادت پہلے بھی تھی۔ تنگ موگانگ میں چلنے کا زیادہ تجربہ ہوا۔ ایک دفعہ میں دن کے چار بجے گاؤں سے لیہہ روانہ ہوا اور ساری رات مسلسل چل کر صبح ناشتے پر گھر پہنچا۔ تنگ موگانگ سے لیہہ ۹۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ تیسرے روز میں واپس لوٹا۔ مجھے صرف تین دن کی چھٹی کا حق تھا۔ تب سڑک نہیں تھی اور گھوڑے کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔

۱۹٦۰ء میں، میں نے انگریزی میں بی۔اے آنرز پاس کیا اور ۱۹٦۲ء میں بی۔اے کی تکمیل کی۔ ۱۹٦۳ء میں میں مرکزی سرکار کے شعبہ اطلاعات میں لیہہ میں فیلڈ پبلسٹی آفسر تعینات ہوا۔ ان ایام میں تخلیقی کام تو بہت کم ہوتا تھا البتہ میں مطالعہ اچھا کرتا تھا۔ میری ڈائیری کے مطابق ۱۹٦٦ء میں میں نے ۹۸ کتابوں کا مطالعہ کیا جبکہ ۱۹٦۸ء میں سو سے زائد کتابیں پڑھیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ کسی سال کتابوں کی تعداد اس سے کم ہوتی تھی۔ زیادہ تر میں علمی اور ادبی کتابیں پڑھتا تھا۔ خاص کر اردو ادب کی تمام اصناف میں دلچسپی لینے لگا اور متعدد کتابیں زیر مطالعہ آئیں۔ ان میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، پریم چند، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قراۃ العین حیدر، شعرا میں فیض احمد فیضؔ، مجاز، جذبیؔ، سردار جعفری، غالبؔ، اقبالؔ، نقادوں میں احتشام حسین، آل احمد سرور، ممتاز حسین، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، محمد حسن وغیرہ۔ مزاحیہ نگاروں میں کنہیا لال کپور،

شوکت تھانوی، فرحت کاکوروی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں انگریزی کی معرفت دوسری زبانوں کے ادیبوں کی کتابیں پڑھیں۔ میں نے ان پر نوٹ اور تاثرات لکھے۔ متعدد پسندیدہ افسانوں کے علاوہ ڈیڑھ سو سے زیادہ ناولوں پر نوٹ اور تبصرہ لکھے ہوں گے۔ ان میں اردو کے شاہکار ناولوں کے علاوہ دنیا کے پچاس سے زیادہ مشہور ناول ہیں۔ ان کے علاوہ سنجیدہ موضوعات جیسے مذہب، تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور مختلف علوم وفنون سے متعلق کتابوں سے نوٹ قلم بند کئے ہیں۔ جن کی اساس پر بعد میں مجھے مضامین اور کتابیں لکھنے میں مدد ملی۔ مجھے ادب کے علاوہ مذہب، نفسیات، فلسفہ، تاریخ جیسے سنجیدہ موضوعات سے دلچسپی رہی ہے۔ ذہن میں کوئی نادر خیال آتا تو میں فوری طور قلم بند کرتا تھا۔ کئی دفعہ ایسے میں کہانیوں کے لئے مواد مل جاتا۔ میں نے پڑھا تھا کہ گوئٹے کو جب کوئی نادر خیال ذہن میں آتا، ایسے میں اگر وہ گھوڑے پر سوار ہوں تو گھوڑے سے اتر کر اسے لکھتے تھے۔ میں بہت برسوں سے ایسے خیالات کو نوٹ کرتا آرہا ہوں اور سال کے اختتام پر انہیں ایک کاپی پر درج کرتا ہوں۔ ان کی تعداد دو ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ اسی طرح میں اخبارات اور رسائل کے تراشے سنبھال کر رکھتا ہوں جن میں کچھ میں نے اخبار کے لئے کالم لکھنے میں استعمال کئے ہیں۔

فیلڈ پبلسٹی میرا پسندیدہ محکمہ تھا۔ یہاں مجھے لداخ کا تقریباً سارا علاقہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم گاؤں میں دستاویزی فلمیں دکھاتے تھے۔ ایک دو گاؤں میں جہاں سڑک نہیں تھی ہم نے جنریٹر کے نقل وحمل کے لئے اونٹ کا استعمال کیا ہے۔ تب لداخ کے اکثر لوگوں کے لئے فلم نئی تھی۔

مجھے اداکاری اور ہدایت کاری کا تجربہ تھا۔ ہم Variety Show کے نام سے اپنا پروگرام بناتے تھے، جس میں Skit، ناچ اور گیت پیش کرتے تھے۔ میرا

دوست عبدالحکیم اداکاروں کو ناچ سکھاتے تھے۔انہوں نے کوریوگرافی کی کوئی ٹریننگ نہیں لی تھی بلکہ فلمیں دیکھ کر ناچ کے مختلف گر سیکھے تھے اور فلمی گیتوں کی دھن پر یہ ناچ پیش کئے جاتے تھے جو تماشائیوں میں مقبول تھے۔ Skits کی ہدایت کاری اور کومنٹری میرے ذمہ تھی۔ ہمارا ایک ورائٹی شو مقابلتاً بڑا کامیاب رہا۔ پہلے پہل ہم نے اسے لیہہ کے ایک سنیما ہال میں دکھایا۔ایک فوجی ڈاکٹر نے اسے دیکھا تھا اور اسے پسند آیا تھا۔انہوں نے ہم سے استدعا کی کہ اسے آرمی جنرل ہسپتال میں دکھائیں۔وہاں ہم نے تین شو کئے۔اس کا شہرہ ہوا،ہمیں اس کے کئی شو آرمی آڈیٹوریم ہال میں کرنے پڑے۔ ہزاروں فوجیوں نے اسے دیکھا۔آخر میں خطے میں فوج کے جرنیل آفیسر کمانڈنگ اسے دیکھنے آئے۔ میں نے فرداً فرداً اداکاروں کا تعارف کیا۔ ایک فوجی افسر نے ہمیں چھپا رستم سمجھا۔ وہ بولے ''آپ لوگ آج تک کہاں چھپے تھے؟''۔یہ پروگرام میری ڈیوٹی کا حصہ بنا تھا۔اس ورائٹی شو کا آخری پروگرام ہمیں ایک لیفٹیننٹ جرنیل کی تفریح کے لئے کرنا پڑا، جو لیہہ دورے پر آیا تھا۔

میں فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔۱۹۶۵ء میں لیہہ میں فٹ بال کی دو بڑی ٹیمیں تھیں۔مجھے ایک ٹیم میں شامل کیا گیا۔میں فارورڈ میں کھیلتا تھا۔تب لداخ میں کرکٹ اور آئس ہاکی مروّج نہیں تھے جو آج کل بڑے مقبول ہیں۔

میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑا بیٹا اقبال احمد اور منجھلی بیٹی فرحانہ یاسمین ڈاکٹر ہیں اور چھوٹا بیٹا ہوٹل چلاتا ہے۔میری اہلیہ امینہ بیگم استانی رہی ہیں۔ ہماری شادی ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی نے مہاتما گاندھی کی برسی پر ان کی حیات اور فلسفے پر قلم کاروں سے کتاب/مسودہ طلب کیا۔میں نے موضوع پر اکادمی کو ایک کتابچہ کا مسودہ پیش کیا اور مجھے پہلا انعام ملا۔اسی سال یو۔پی۔ایس۔سی سے

انڈین انفارمیشن سروس کا امتحان پاس کیا اور اگلے سال جموں میں پریس انفارمیشن بیورو کے دفتر میں بطور انفارمیشن اسسٹنٹ جوائن کیا، جس کا مجھے بڑا پچھتاوا ہوا۔ وہاں سے میرا تبادلہ سرینگر ہوا۔ سرینگر میں مجھے ریسرچ لائبریریوں اور محافظ خانے سے لداخ کے بارے میں مواد جمع کرنے کا موقع ملا۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور کتابوں پر ٹوٹ پڑا جیسے بھوکا کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ ایک ہی سال میں میں نے چالیس کتابوں سے نوٹ لکھے۔ یہ زیادہ تر سفرنامے تھے۔ تاہم ان میں خاص طور پر انیسویں اور بیسویں صدی کے لداخ کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ لداخ میں اس ضمن میں صرف دو کتابوں کے نام سنے تھے۔ ایک کے مصنف وزیر حشمت اللہ تھے اور دوسری موراوین مشن کے پادری ڈاکٹر اے ایچ۔ فرانکی نے لکھی تھی۔ اول الذکر کی تصنیف مجھے مستعار ملی اور دوسری تقریباً نایاب تھی۔ اس لئے لداخ کے ماضی کے بارے میں مجھے بڑی تشنگی رہتی تھی۔ سرینگر میں اس ضمن میں اہم اور دلچسپ معلومات سے فیض یاب ہوا۔ لیکن تب فوٹو کاپی کی سہولیت نہیں تھی اور لکھنا پڑتا تھا۔

سرینگر علمی اور ادبی لحاظ سے میرے لئے سازگار ثابت ہوا۔ میرے مضامین اور کہانیاں یکے بعد دیگرے مختلف رسائل میں چھپنے لگے۔ ان میں آج کل، شاعر، شمع، بانو، ایوانِ اردو، شبستان، پالیکا سماچار، فلمی ستارے، شیرازہ، ہمارا ادب، نرالی دنیا، تعمیر، العطش، بیسویں صدی، واقعات، سبق اردو، آواز، شاندار، جوگی، کھلونا وغیرہ شامل ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی میں پروگرام پیش کئے اور سکرپٹ لکھے۔ ہندی میں پراگیہ کا امتحان پاس کیا۔ ریڈیو کے لئے پروگرام ایکزیکیٹو کا انٹرویو دیا اور منتخب ہوا لیکن جوائن نہیں کیا اور پریس انفارمیشن بیورو میں بطور اسسٹنٹ انفارمیشن افسر کام کرتا رہا، جہاں مجھے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا اچھا تجربہ حاصل ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں

ریڈیو سٹیشن سرینگر میں بطور اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر جوائن کیا۔ اسی سال میری پہلی کتاب اور افسانوی مجموعہ ''زوجی لا کے آر پار'' شائع ہوا۔ میں نے اسی سال راجستھان یونیورسٹی سے بذریعہ مراسلت تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں بالترتیب میرے ناول ''وہ زمانہ'' اور ''دل ہی تو ہے'' شائع ہوئے۔ موخرالذکر کو کلچرل اکیڈمی کی طرف سے اردو میں سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۹ء میں ریاستی سرکار نے بچوں کے بین الاقوامی سال پر بچوں کی کتابوں 'کتابوں کی دنیا'' اور ''لداخ کی سیر'' کے مسودوں پر مجھے ایوارڈ سے نوازا۔ مہاراشٹر سٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے ''آج کل'' نئی دہلی میں ۱۹۷۴ء میں لداخ سے متعلق میرے مطبوعہ مضمون کے اقتباسات گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کی اردو درسی کتابوں میں شامل کیئے۔

سرینگر میں مختلف تقریبات میں دانشوروں، ادیبوں اور علماء سے ان کی تقریریں، کلام وغیرہ سننے کا موقع ملا، جن میں مولانا وحیدالدین خان، مولانا حفیظ الرحمٰن، مولانا سعید محمد اکبرآبادی، مولانا طیب، کرشن چندر، عصمت چغتائی، آل احمد سرور، قراۃ العین حیدر، فراؔق گورکھپوری، سردار جعفری، ہمایوں کبیر، شکیل الرحمٰن، ساؔغر نظامی، کشمیری لال ذاکر وغیرہ اور کشمیر کے ادبا اور شعرا بھی شامل ہیں۔

انہی ایام میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن دہلی سے صحافت میں تین ماہ اور دو ماہ کی یکے بعد دیگرے ٹریننگ لی۔ نامہ نگار کی حیثیت سے لداخ، دہلی، سرینگر اور جموں میں پریس کانفرنسوں اور میٹینگوں میں جاتا رہا، ان پروگراموں میں کئ وزیراعظم اور صدر جمہوریہ شامل تھے۔ لیہہ میں کئ مرکزی اور ریاستی وزرا سے ریڈیو کے لئے انٹرویو لئے۔ اس کے علاوہ کئ مشہور فلمی ہستیوں کے انٹرویو لئے، جن میں دیوانند، سنیل دت، سنجے خان، شبانہ اعظمی، جاوید اختر، شیکھر کپور، انوپ جلوٹہ وغیرہ

شامل ہیں۔

۸۰ء کی دھائی میں میری علمی اورادبی کاوشوں میں اضافہ ہوا۔میری تخلیقات مقابلتاً زیادہ چھپنے لگیں۔سمیناروں میں مقالے پڑھے۔علمی، ادبی اور مذہبی مجلسوں میں تقاریر کیں۔ریڈیواورٹی وی پرمتعدد پروگرام کئے۔لداخ کی تاریخ پر'لداخ کی کہانی' کےعنوان سے لیہہ ریڈیوسٹیشن سے ۲۶ پروگرام نشر ہوئے۔نیز کئی اورفیچر نشر ہوئے،جن میں ایک ''میراادبی سفر'' تھا۔

۱۹۸۰ء میں میری کتاب ''صنم نربو'' منظرعام پرآئی۔یہ واحد سوانح حیات ہے جو میں نے لداخ کی ایک مقبول شخصیت صنم نربو کے بارے میں لکھی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں بھارتی کلچر شعبہ کی فرمائش پر لداخ کے تیوہاروں کے بارے میں سو صفحات پرمشتمل روداد لکھی۔

ٹی وی سیریل ''گل،گلشن،گلفام'' دیکھ کر مجھے لداخ کے ماضی اورحال پرمبنی ۲۶ قسطوں پرایک ٹی وی سیریل لکھنے کی تحریک ملی۔''گل،گلشن،گلفام'' کے ہدایت کارویدراہی تھے جوجموں سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کہانی کاربھی ہیں۔میں نے ان کو سیریل بھیجا۔انہیں یہ پسندآیا اور وہ بمبئ سے لیہہ آئے۔انہوں نے سیریل کے مکالمے اورسکرین پلے لکھے۔میں نے ویدراہی سے کہا کہ مجھے ''گل،گلشن،گلفام'' پسندآیاتو وہ بولے''یہ سیریل اس سے بھی اچھا ہوگا''۔ویدراہی کی کوشش کے باوجود دوردرشن سے منظوری نہیں ملی۔پرائیویٹ چینل اسے خریدرہے تھےلیکن ویدراہی کے بقول وہ ان کواچھی رقم نہیں دے رہے تھے۔لداخ جیسی دورافتادہ جگہ بمبئ سے جنریٹر،سامان اوراداکاروں کولانا کافی مہنگاہے۔اس لئےمعقول رقم مطلوب ہے۔'' اس طرح یہ سیریل نہیں بن سکااورہماری محنت رائیگاں گئی۔ویدراہی نےفلم بندی کے لئےکئی Locations دیکھے۔چھوٹے رول کے لئےکئی مقامی اداکاروں کوانتخاب کیا

اوراس سیریل کے لکھنے کے لئے مجھے کچھ معاوضہ بھی دیا۔

۱۹۸۹ء میں مجھے پہلے پہل بیرون ملک جانے کا موقع ملا۔ انٹرنیشنل ایسوسی سیشن فار لداخ سٹڈیز(IALS) کی طرف سے مجھے 'لداخ میں اسلام کی مختصر تاریخ' کے عنوان پر ایک مقالہ پیش کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں نے موضوع ہذا پر انگلینڈ کے شہر برسٹل میں منعقدہ ایک سمینار میں روشنی ڈالی۔ اسی دہائی کے دوران میں نے ایک انگریزی ہفت روزہ ''نوائے صبح'' کے لئے لداخ کے بارے میں ایک کالم لکھا، جو تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔

میں ۱۹۹۲ء میں پونے تین سال پہلے ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ میں سرینگر میں ریڈیو کے کام سے مطمئن نہیں تھا۔ ادارہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً اجرا کردہ رہنما اصول اور محکمہ جاتی ٹریننگ کے مطابق خبروں کی نشریات میں راست گوئی اور غیر جانبداری کی ہدایات دی جاتی ہیں تاکہ سامعین میں ادارے کی Credibility(اعتماد) قائم رہے لیکن سیاسی مداخلت کی وجہ سے رہنما اصول پر عمل کرنا ممکن نہیں رہتا ہے۔ میں ذاتی طور افسرانِ بالا سے ملا اور وزارتِ اطلاعات و نشریات کے کسی اور ادارے میں تبدیل کرنے کیلئے استدعا کی۔ میں بذات خود فیلڈ پبلسٹی یا پبلیکیشنز ڈویژن کے اردو ماہنامہ ''آج کل'' کا مدیر بننے کا خواہش مند تھا۔ لیکن میری درخواست پر شنوائی نہیں ہوئی۔

اسی دوران انجمن معین الاسلام کی تعلیمی کمیٹی نے مجھے اسلامیہ پبلک ہائی اسکول لیہہ میں پرنسپل کے عہدے کی پیشکش کی جو میں نے قبول کی۔ میں نے دو سال اس عہدے پر کام کیا۔ تینگ موگانگ سکول کے سابق طلباء کی طرح اسلامیہ سکول میں میری سروس کے دوران زیر تعلیم طلبا آج بھی میری قدر اور عزت کرتے ہیں۔ میں اپنی علمی اور تخلیقی مصروفیات کی وجہ سے مستعفی ہوا۔

۱۹۹۳ء میں میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دوراہا'' شائع ہوا۔ لگ بھگ یہ سارے افسانے مختلف رسائل میں چھپے تھے۔ اس میں ''ماں'' کے عنوان سے میری ماں کے بارے میں بھی ایک کہانی ہے۔ فروغ اردو کے لئے لیہہ میں ''بزمِ ادب'' کے نام سے برج پریمی کے فرزند اویناش ایمہ نے لیہہ میں ایک ادبی تنظیم قائم کی اور مجھے اس کا صدر منتخب کیا۔ لیہہ میں کئی ادبی محفلیں منعقد کی جن میں مقامی اور غیر مقامی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات پیش کی۔

اسی دوران مجھے بہ اتفاق رائے لداخ مسلم ایسوسی ایشن کا نائب صدر اور سنی مسلمانوں کی تنظیم انجمن معین الاسلام کا نائب صدر انتخاب کیا۔ خود مختار پہاڑی کونسل کی مانگ کے سلسلے میں دہلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ وفد میں اور بھی ارکان تھے۔ آرغون مسلمانوں کو شیڈولڈ ٹرائب کا درجہ دلانے کے سلسلے میں ایک سے زیادہ مرتبہ آرغون مسلم وفد کی قیادت کی۔

۱۹۹۳ء میں مجھے لیہہ کی ایک غیر سرکاری تنظیم LEHO نے برازیل بھیجا اور تقریباً ایک ماہ طویل ورک شاپ میں حاضری کے علاوہ ایک سیمینار میں لداخ کے حوالے سے تعلیم پر ایک مقالہ پیش کیا۔ ۱۹۹۵ء میں IALS نے بون، جرمنی اور پاک تبت پروجیکٹ نے اسلام آباد، پاکستان مدعو کیا جہاں میں نے مقالے پیش کیے۔ ۱۹۹۸ء میں مجھے IALS کا آنریری سکریٹری اور خزانچی مقرر کیا گیا۔ اس سے پہلے ڈنمارک میں IALS کی کانفرنس ہوئی اور وہاں اپنا پیپر پڑھا۔

نوے کی دہائی میں میری مالی حالت بہتر ہوئی۔ زندگی بھر تنگی ترشی رہی تھی۔ پنشن کی رقم سے دس کمروں پر مشتمل ایک ہوٹل تعمیر کیا۔ دوردرشن سرینگر کے لئے متعدد سکرپٹ لکھے جن سے اچھی خاصی آمدنی رہی اور اپنے مکان کو وسعت دی۔ ۲۰۰۱ء کی دہائی تخلیقات کے لحاظ سے اچھا سال تھا۔ اس دہائی کے دوران ذیل کی کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔ لداخ۔تہذیب وثقافت

۲۔ قلم،قلم کاراور کتاب

۳۔ اسلام اور سائنس

۴۔ The Forsaking Paradise

مواخرالذکر کتاب میری بارہ اردو کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ڈاکٹر روینہ اگروال نے ان کہانیوں کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔موصوفہ تب امریکہ میں ایک کالج میں پڑھاتی تھیں۔

اس سے پہلے ''قلم،قلم کاراور کتاب'' کی چار قسطیں ماہنامہ ''آج کل'' میں شائع ہوئی تھیں۔جن کا مجھے اچھا Feed Back ملا۔''دنیا کے مشہور ناول'' کو بھی اچھا Feed Back ملا تھا۔یہ طویل مضمون بھی ''آج کل'' میں چھپا تھا۔

۲۰۰۳ء میں جموں میں ریاستی کلچرل اکیڈمی کے اہتمام سے میری ادبی خدمات کے ضمن میں ایک پروگرام ''ملاقات'' کا اہتمام کیا،جس میں ریاست کے متعدد ادیبوں نے سوالات پوچھے۔اسی سال ریاست کے وزیراعلیٰ مفتی محمد سعید اور ہندو کیندرا نے ادبی خدمات کے لئے Memento پیش کئے۔

۲۰۰۷ء میں مجھے ریاستی سرکار نے حج کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔

اس دوران کئی ٹی وی چینلوں نے میرے انٹرویو لئے۔ان میں NDTV، CNN،Times،E TV (اردو) شامل ہیں۔اسے پہلے اور اس دوران کشمیر ٹائمز، Hindu،Excelsior اور کشمیر اعظمیٰ میں میرے انٹرویو چھپے تھے۔

۲۰۰۹ء میں میری اہلیہ اور میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔اس کی روداد سرینگر کے ایک روزنامہ ''اطلاعات'' میں سات قسطوں میں چھپی۔اسے پہلے بھی میں نے آفتاب، سرینگر ٹائمز اور آئینہ میں کچھ کالم لکھے ہیں۔اب کے ''کرگل

رنگیول'' میں میرے مستقل کالم ''لداخ کے شب و روز'' اور ''آج کی بات'' کے عنوانات سے چھپتے رہے ہیں جن کی پذیرائی کرگل اور لیہہ میں ہوئی ہے۔ کشمیری زبان کے معروف ادیب غلام نبی خیاؔل کی فرمائش پر ان کے انگریزی ہفت روزہ Voice of Kashmir میں ایک سال سے Ladakh Diary کے نام سے ایک کالم تحریر کیا۔

۲۰۱۰ء میں بورڈ آف سکول ایجوکیشن نے انگریزی میں ترجمہ میری کہانی 'آوی لے' کو میٹرک کی انگریزی درسی کتاب کے نصاب میں شامل کیا۔

۲۰۱۱ء سے تادم تحریر میری ذیل کی کتابیں شائع ہوئیں۔

ا۔ ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' (۲۰۱۱ء)

ب۔ Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia(2011)

ج۔ ''دو ملک ایک کہانی'' افسانوی مجموعہ (۲۰۱۵ء)

د۔ ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے (۲۰۱۷ء)

''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' کو لاہور پاکستان کے ایک پبلشر مکتبۂ جمال نے شائع کیا ہے۔ کتاب ہٰذا مرکزی وزارت انسانی وسائل کے ادارے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے چھاپی تھی۔ Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia کو ریاستی کلچرل اکیڈمی نے ۲۰۱۱ء کی بہترین انگریزی کتاب قرار دیا اور ایوارڈ سے نوازا۔

اس دوران انگریزی اور اردو میں میرے متعدد مضامین اور کہانیاں چھپی۔ انگریزی مضامین لداخ سے وابستہ ایک نیا ماہنامہ STAWA میں ۲۰۱۴ء سے لگ بھگ باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ نیز Himalayan Heritage اور Ladakh

Studies میں بالترتیب دو اور ایک مضمون شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ نوبراہ وادی سے متعلق ایک اردو کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۲۰۱۳ء میں جموں و کشمیر اردو اکیڈمی نے سرینگر میں ایک تقریب میں ادبی اور تحقیقی کام کے لئے مجھے شال اور سند سے نوازا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس بشیر احمد کرمانی اور معروف صحافی مرحوم سید شجاعت بخاری تھے۔

۲۰۱۱ء میں دہلی میں ایرانی کونسل کے اہتمام سے امام خمینی کی برسی پر ایران گیا۔ بعد میں اس سفر کی روداد ''آج کل'' دہلی میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے بطورِ ایک صحافی اور ادیب ائرانڈیا کی دعوت پر سنگا پور کی سیاحت کی۔ گروپ میں متعدد صحافی، ادیب اور فن کار تھے۔

۲۰۱۴ء میں جموں یونیورسٹی کے طالب علم محمد سجاد رونیال کو اپنے تحقیقی مقالہ ''لداخ میں اردو زبان و ادب اور عبدالغنی شیخ'' پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی۔ پروفیسر اسداللہ وانی کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔ جبکہ ۲۰۱۵ء میں فیاض حمید کو ان کے مقالہ ''عبدالغنی شیخ بہ حیثیتِ فکشن نگار'' کے لئے ایم۔فل کی ڈگری عطا کی گئی۔

راقم الحروف سے پچھلی کئی دہائیوں کے دوران بیسیوں ملکی غیر ملکی اور لداخی طلبا اور طالبات نے اپنی پی۔ایچ۔ڈی اور ایم۔فل کے سلسلے میں رابطہ کیا ہے۔ امریکی اور یورپی سیاحوں اور طلبا کو لداخ کے بارے میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ ان سیاحوں کو اسلام، بودھ، مسلم تعلقات جیسے موضوعات سے بھی بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔

میں سماجی اور علمی کام بھی کرتا ہوں۔ اس ضمن میں درخواستیں لکھنا، طلبا کے لئے مختلف تحریری کام، معلومات فراہم کرنا، مشورے دینا، انٹرویو دینا اور حسبِ توفیق

مالی معاونت شامل ہیں۔

میں نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام کیا ہے۔ چھوٹے موٹے ترجمے کے علاوہ محکمہ صحت کے لئے نفسیات اور صحت پر انگریزی سے اردو میں ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ نیز ایک غیر سرکاری تنظیم کے لئے ماحولیات اور لیہہ میں تبّتی پناہ گزینوں کے لئے کتابچہ کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ کے لئے گاہے گاہے مجھے معاوضہ بھی ملا ہے۔

میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ میری چند کہانیوں کی اچھی پذیرائی ہوئی ہے۔ میری ایک کہانی ''ہوا'' کا انگریزی، جرمنی، ہندی، گجراتی اور بنگالی میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کی انگریزی مترجم ڈاکٹر روینہ اگروال کو یہ کہانی بڑی پسند ہے۔ انہوں نے کُل بارہ کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر روینہ نے ''ہوا'' امریکہ اور ڈنمارک میں سمیناروں میں پڑھی۔ ڈنمارک میں، میں بھی موجود تھا اور سامعین نے تالیوں سے کہانی کی پذیرائی کی۔ نام اور جینی عنوانات کی کہانیاں بالترتیب مختلف علاقائی زبانوں سے منتخب تلگو اور کشمیری میں مترجمہ کہانیوں کے مجموعوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ''جینی'' آکاش وانی دہلی کے اردو پروگرام اور ''حمال'' ریڈیو کشمیر سے ادبی پروگرام میں نشر ہوئیں۔ دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ذاکر حسین کالج کی طرف سے قومی سطح کے ایک سمینار میں کہانی پڑھنے کے لئے مجھے مدعو کیا گیا۔ میں نے ایک سیشن میں اردو میں 'جینی' اور انگریزی میں Wind یا 'ہوا' پڑھی۔ اس سیشن کی صدارت اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ایک جرمن اردو استاد ریز کیمنگ نے میری دو اردو کہانیوں ''ہوا'' اور ''دوسرا خط'' کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو جرمن زبان کے ایک جریدہ میں شائع ہوئی ہیں۔

میں نے متعدد قلم کاروں کو اپنی کتابیں نذر کی ہیں، البتہ کسی سے درخواست نہیں کی ہے کہ وہ ان پر اپنے تاثرات یا تبصرہ لکھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کسی سے درخواست کر کے تاثرات مانگیں تو مروت میں آ کر مثبت باتیں لکھ سکتا ہے۔ فرمائش کے بغیر بے ساختہ اپنے تاثرات اور آرا دیتا ہے تو بے لوث اور مخلصانہ ہوتا ہے۔ میں کسی ادیب کو زحمت دے کر اس کے لئے بار گراں نہیں بننا چاہتا۔ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں اپنی اوقات کو جانتا ہوں۔ میں کوئی بلند پایہ قلم کار نہیں ہوں کہ جس کی کتاب کی ہر جگہ مانگ ہو یا جس کا ترجمہ ہو۔ تاہم جن ادیبوں نے مجھے خطوط یا تاثرات لکھے ہیں، وہ بے ساختہ لکھے گئے ہیں اور یہ مجھے پر خلوص اور محبت بھرے لگے ہیں۔

پڑھنے لکھنے کے باوجود کئی چیزوں کے نبھانے میں مجھے جھجک آتی تھی اور میں بُز دل تھا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک مرحلے پر میں نے محسوس کیا کہ جن چیزوں اور باتوں کے کرنے میں مجھے خوف ہوتا ہے، مجھے ان پر غالب آنا چاہئے۔ چنانچہ اکیلے میں قلابازی (Somersault) کی۔ بندوق چلائی، گاڑی چلائی، سائیکل چلانا سیکھا۔ گھوڑ سواری میں نے مال مویشی فارم میں کی تھی۔

میرے خلاف شکایات بھی ہوئی ہیں جن میں دو تین، سنگین نوعیت کی تھیں۔ میں میڈیا میں کام کرتا تھا، سرکاری ملازم تھا، جس کے خلاف شکایتیں کرنا آسان ہوتا ہے۔ میرے اپنے نظریات ہیں۔ اپنی انفرادیت ہے۔ اپنے اصول ہیں۔ میں لکھتا تھا۔ تاہم میرا بال بیکا نہیں ہوا۔ کوئی آنچ نہیں آئی، کیونکہ میں سچائی اور حق پر تھا۔ تاہم مجھے پختہ اعتقاد ہے کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ چاہے یہ معاملات زندگی ہوں یا موت ہو۔ مجھے اس کا عملی تجربہ ہے۔ میں کئی دفعہ موت کے منہ سے نکل آیا۔

میں لیہہ کے پاس ایک گاؤں ماٹھوویٹرنری فارم پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ایک روز سہ پہر کو گھوڑے پر سوار اپنے ڈیرے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ میں نے کچھ گھاس رات کو گھوڑے کو کھلانے کیلئے اس کی پیٹھ پر رکھی تھی۔ جب گھوڑا چلا تو گھاس گرنے لگی۔ پیچھے نظر ڈالتا ہوا گھوڑا گھبرا کر بدک گیا۔ادھر میرا بوٹ رکاب میں پھنس گیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا۔میری آنکھوں کے سامنے موت منڈلانے لگی۔ یہ بھیانک موت ہوسکتی تھی اور جسم سے ٹانگیں اور بازو الگ ہوسکتے تھے۔خوش قسمتی سے اس صورت حال میں میرا ہوش برقرار رہا اور میں نے لگام کو تھامے رکھا۔ماٹھولبرانگ کی عمارت کے پاس گھوڑا دوڑ رہا تھا کہ اچانک مکان کی آڑ میں سے ایک آدمی نکلا اور گھوڑے سے ٹکرا کر چاروں شانے چت ہوا۔گھوڑا رک گیا۔میں نے اسی لمحہ فی الفور رکاب میں سے پاؤں نکالے اور اتر گیا۔آج بھی جب اس واردات کو یاد کرتا ہوں تو جسم میں سنسنی سی دوڑتی ہے۔تب میں انیس سال کا تھا۔اس واقعہ سے ایک سال پہلے میں سرینگر میں سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ایک روز مجھے دریائے جہلم تیر کر پار کرنے کی سوجھی۔ان دنوں امیرا کدل کے نیچے تیراکی کی جاتی تھی۔ میں نے شاید دریا کا آدھا پاٹ تیرا ہوگا۔میرے بازو تھک گئے۔میں مڑا اور بمشکل تیرتا ہوا دریا کے کنارے ایک ڈونگا تک پہنچا۔ دونوں ہاتھ اور بازو ڈونگے پر لٹکا دئے۔ایسے میں تھکے ہوئے بازوؤں کو تھوڑی سی راحت ملی اور جان بچی۔

فیلڈ پبلسٹی محکمہ میں ڈیوٹی کے دوران میں جیپ میں خلسے گاؤں آرہا تھا۔ اچانک موڑ سے نیم فوجی بیکن کی ایک شکتی مان گاڑی تیزی سے اترائی میں ہماری طرف بڑھی۔ بریک لگانا اس کے لئے مشکل تھا اور تنگ سڑک پر دائیں بائیں مڑنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ بڑی گاڑی نے ہماری گاڑی کو زور سے ٹکر ماری اور مجھے سیٹ پر سے اچھال پھینکا۔میرے رخسار پر ہلکا سا زخم آیا اور معجزاتی طور بچ گیا۔

ایک روز میں اپنے مکان میں ایک کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک کچن سے بیوی کی آواز آئی۔ میں کچن میں گیا۔ گیس کا پائپ چولہے سے نکل آیا تھا اور شفاف پائپ میں سے آگ کا شعلہ تیزی سے گیس سلینڈر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چلا کر بیوی سے بھاگنے کے لئے کہا۔ وہ خطرے سے بے خبر اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اسی لمحہ دماغ نے کام کیا اور میں نے فوراً گیس کا پلگ بند کیا۔ ورنہ چند لمحوں میں گیس سلینڈر زوردار دھماکے سے پھٹ گیا ہوتا۔

۸/اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدے سے معزول کر کے گرفتار کیا گیا۔ اس روز بڑا خون خرابہ ہوا۔ لال چوک لوگوں کے مظاہروں کا مرکز تھا۔ جہاں ہمارا ہوسٹل تھا۔ دوسرے روز ہم لال چوک گئے۔ ماحول پُر تناؤ تھا۔ پلیڈیم کے پاس چند سپاہی بندوق تانے کھڑے تھے۔ اس کے اردگرد چند آدمی موجود تھے۔ اچانک ایک آدمی نے شیر کشمیر کا نعرہ لگایا۔ فوجیوں نے بندوق کی شست باندھی۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگنے پر پیچھے سے کسی کی تمسخرانہ آواز آئی اور ساتھ ہی دو گولیاں چلیں۔ بعد میں سنا کہ وہاں دو آدمی مارے گئے۔

میں سرینگر میں اپنی بہن کے مکان میں سکونت پذیر تھا۔ ایک دفعہ آدھی رات کے وقت آگ چٹخنے کی آواز ہوئی اور ساتھ ہی کسی چیز کے جلنے کی بو آئی۔ میں فوراً اٹھا اور اس طرف بڑھا، جہاں سے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ چھ سات فٹ اونچا ایک خانے میں سے آ رہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دونوں ہاتھوں کے سہارے خانے میں جھانکا۔ بجلی کے تار جل رہے تھے۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں اور ذرا سا آگے گئی ہوتیں تو بجلی کا جھٹکا میرا کام تمام کرتا۔

میں کیوں لکھتا ہوں؟ ادیبوں سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے۔ اکثر ادیبوں کا جواب لگ بھگ یکساں ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو سے جب یہ سوال کیا گیا تو منٹو

نے جواب دیا۔ ''میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں؟ میں کیوں پیتا ہوں؟''

اس سوال کا جواب مجید امجد نے قدرے دوسرے انداز میں یوں دیا ہے۔ ''آپ تو پوچھتے ہیں میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی دریا سے پوچھے ''تم کیوں سفر میں ہو؟ باغوں کی کوئلوں سے کوئی کہے، تم کیوں کوکتی ہو؟ مستانے جھونکوں سے کوئی سوال کرے، تم ان اوس بھری ہریالیوں میں کیوں لڑکھڑاتے پھرتے ہو؟ میں نے منٹو اور مجید امجد کے یہ جوابات پڑھے نہیں ہوتے تو شاید میں نے بھی اسی طرز کا جواب دیا ہوتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر پڑھنا لکھنا نہیں ہوتا، تو زندگی اجیرن ہوتی، جینا حرام ہوتا۔ میرے لئے لکھنا پڑھنا زندگی کا بڑا مصرف ہے۔

ممتاز حسین نے ایسی ہی ذہنی کیفیت کا جواب یوں دیا ہے۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں لکھنے پر اندر سے مجبور ہوں۔ کبھی جلدی جلدی اور کبھی طویل خاموشی کے بعد''۔

ناول نگار گراہم گرین نے لکھا ہے۔ ''لکھنا ایک قسم کا علاج و معالجہ ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو نہیں لکھتے، مصوری نہیں کرتے یا دھنیں نہیں بناتے۔ وہ کیسے دیوانگی، مالیخولیا اور خوف سے محفوظ رہ سکتے ہیں، جو انسانی فطرت میں دخل ہیں۔''

کبھی کبھار زیادہ لکھنے سے میری انگلیاں دکھتی ہیں اور میں پریشان ہو جاتا ہوں کہ درد کب ختم ہوگا؟ اگر ختم نہ ہو تو کیا ہوگا؟''

میرے ساتھ قلم، کوئی کتاب یا جریدہ اکثر رہتا ہے۔ اگر کوئی نادر خیال ذہن میں آجائے تو میں اسے قلم بند کرتا ہوں۔ چوک ہوتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں نادر خیال کو تحریر نہیں کر سکا۔ اس خیال پر ایک کہانی تخلیق ہو سکتی تھی۔

میں کیوں لکھتا ہوں؟ میں نے اوپر جو جواب دیا ہے۔ وہ ادھورا ہے۔ میں اس لئے لکھتا ہوں کہ جس بات سے میں متاثر ہوتا ہوں، اس میں قارئین کو بھی شامل

کرنا چاہتا ہوں۔ میں کسی جگہ، کسی کتاب، کسی انسان اور کسی واقعہ سے متاثر ہوتا ہوں۔تاثرات سرور بخش اور امید افزا بھی ہوتے ہیں اور مایوس کن اور کربناک بھی ہوتے ہیں۔

میں ایک خوبصورت جگہ دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں اس کے حسن کے گن گاتا ہوں۔ پھر قارئین کو اپنے مشاہدے میں شریک کرتا ہوں تا کہ وہ میری آنکھوں سے اس جگہ کو دیکھیں اور داد دیں۔کوئی کتاب اچھی لگے تو میں دوسروں کو اس کتاب سے روشناس کراتا ہوں اور اسے پڑھنے کی تحریک دیتا ہوں۔اسی طرح کسی انسان میں کوئی خاص بات دیکھی، تو میں اس سے متعلق لکھتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ جو چیز مجھے اچھی یا بری لگے تو دوسروں کو بھی اچھی یا بری لگ سکتی ہے۔کیونکہ انسان کی نفسیات ایک جیسی ہوتی ہے۔

ہم جب کسی پر ظلم اور زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں تو ہمارا دل کڑھتا ہے۔اگر میں صاف صاف لکھ نہ سکوں تو ایسے واقعات کو لکھنے کے لئے فکشن کا سہارا لیتا ہوں۔

میں نے دس سال پہلے اپنی کتاب ''قلم، قلم کار اور کتاب'' میں لکھا ہے۔

''انسان اپنے نظریات، اعتقادات، تجربات اور مشاہدات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ورثہ میں دینا چاہتا ہے۔''

سپین کے فلسفی مائیکل ڈی ادنا مونو نے لکھا ہے:

''انسان لافانیت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ موت کے بعد وہ ایک ایسا خلا اپنے پیچھے چھوڑ دے، جس کو کوشش کے بعد پُر کرنا ممکن نہ ہو۔''

کسی نے بڑی سادگی سے کہا ہے۔''کسی کو ادب کا ذوق ہو تو سوائے خامہ فرسائی، کوئی علاج نہیں۔''

میں نے فکشن (کہانیاں اور ناول) ادبی مضامین، تاریخ، سوانح عمری،

خاکے اور سفر نامے لکھے ہیں۔ اخبارات کے لئے کالم اور مذہب، فلسفہ، تعلیم وغیرہ کے بارے میں مضامین قلم بند کئے ہیں۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا کام کیا ہے۔ ریڈیائی بات چیت، فیچر اور ٹی وی کے لئے سیریل اور سکرپٹ لکھے ہیں، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ میں ادب برائے ادب پر نہیں بلکہ ادب میں مقصدیت پر یقین رکھتا ہوں لیکن ادبی نعرہ بازی پر نہیں۔ میں حقیقت نگاری پر یقین رکھتا ہوں۔ حقائق کو دیانت داری سے پیش کیا جائے تو اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مارکسی دانشور اینجلز نے کہا ہے کہ مصنف کے سیاسی اور سماجی خیالات جتنے چھپے ہوئے ہوں گے، فن اتنا ہی لطیف ہوگا۔ میں اپنی انا کی تسکین کیلئے نہیں لکھتا جیسا کہ چند ادیبوں کا دعویٰ ہے۔ ادیب اور قاری میں اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ ایک ادیب کی نظر مختلف علوم، تاریخ اور مذہب پر ہونی چاہئے۔ علم کے ایک شعبہ میں غیر معمولی مہارت حاصل کرنا ایک زندگی میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم مختلف علوم کی مبادیات کی جانکاری ضروری ہے۔ چیخوف کے الفاظ میں ''ادیب کا فرض ہے کہ سب کچھ جانے، ہر بات سیکھے اور معلوم کرے کہ کہیں دھوکا نہ کھائے۔'' بقول ایمرسن، ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے، جو میں اس سے سیکھ سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں اس کا شاگرد ہوں۔''

●●●

(شیخ صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ کے خصوصی شمارہ ''عبدالغنی شیخ لداخی نمبر'' سے ماخوذ ہے، جو 2018 میں شائع ہوا ہے۔ شیخ صاحب کا انتقال 20 اگست 2024ء کو ہوا۔ ادارہ)

☆......نور شاہ

میرے تخلیقی سوتے رومان سے پھوٹتے ہیں!!

میں جہاں پیدا ہوا وہ میری سوچ میں افسانوں اور کہانیوں کی بستی ہے۔ یہ بستی کوہ سلیمان کے دامن اور ڈل جھیل کے کنارے آباد ہے اور سیاحتی اعتبار سے اپنی سندرتا، خوبصورتی اور دلکشی کے لئے سیاحتی نقشے پر ایک اہم اور بلند مقام بنا چکی ہے۔ شکاروں سے ہاوس بوٹوں تک، رنگ برنگ پھولوں کے باغات سے برف پوش پہاڑوں تک میری بستی کی اپنی منفرد سی شان ہے، یہاں حیرت اور تجسس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہر موسم میں قائم و دائم رہتا ہے۔ اس بستی نے اَن گنت موسیقاروں، شاعروں، قلم کاروں، ادیبوں، صحافیوں، ڈاکٹروں، انجینئروں اور صنعت کاروں کو جنم دیا ہے۔ یہ شخصیات اپنی صلاحیتوں کے پس منظر میں ہماری تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر میں بھی یہ بستی کسی طور نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

میں درگہ جن ڈلگیٹ کی بات کر رہا ہوں۔ شہر سری نگر کی ایک بے حد رومانی بستی۔ میرے خوابوں کی بستی اور میں اِسی بستی کا مکین ہوں!!

اِس بستی کی ایک اندرونی سڑک کے آس پاس اب بھی ہمارا مکان کھڑا ہے۔ ''شاہ منزل''۔ حالانکہ اب ہم اس گھر میں نہیں رہتے۔ ہمارا یہ گھر میرے والدین، میں اور میرے تین چھوٹے بھائیوں کے علاوہ میری دو چھوٹی بہنوں پر مشتمل تھا۔ ہمارے والد، جو اَب حیات نہیں ہیں، کا ایک چھوٹا سا بزنس تھا لیکن ابتدائی دنوں سے ہی اُنہیں

ہماری پڑھائی کی فکر لگی رہتی تھی۔ چونکہ ہمارا ابتدائی سکول بھی گھر سے زیادہ دور نہ تھا اس لئے ہمارے والد محترم اکثر سکول آتے اور اساتذہ سے ہماری پڑھائی کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ ہماری والدہ بھی اب حیات نہیں لیکن اس زمانے میں اُنہوں نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ آسانی سے اُردو لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ شاید اسی لئے اُردو کے اخبار روز ہمارے گھر میں پڑھنے کے لئے ملتے تھے۔ اُن دنوں میں اسلامیہ مڈل سکول درگہ جن کا طالب علم تھا۔ میں روز اخباروں کی سرخیاں اپنی کاپی پر اُتار کر اسکول میں ایک بڑے سائز کے بلیک بورڈ پر لکھتا تھا۔ اسی وجہ سے سکولی کتابوں کے علاوہ اردو پڑھنے لکھنے کے تعلق سے اخبارات بھی ایک ذریعہ بن گئے۔ میرے بھائی اگر چہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن بعد میں، رفتہ رفتہ ،اُردو زبان سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم محی الدین شاہ اور مرحوم بشیر شاہ بھی افسانوں اور افسانوی دنیا سے دور نہ رہ سکے۔ مرحوم بشیر شاہ اُردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد ریڈیو کشمیر میں بحیثیت اُردو سکرپٹ رائٹر تعینات ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے ترقی پاتے گئے۔ مرحوم محی الدین شاہ، جو مجھ سے چھوٹے اور مرحوم بشیر شاہ سے بڑے تھے، بنیادی طور پر ایک انجینئر تھے اور بعد میں سول سروس میں آگئے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''پھول اور آویزے'' (آغا ظفر احمد کے ساتھ مل کر) ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ٹھیک اِسی طرح مرحوم بشیر شاہ کا افسانوی مجموعہ ''شب کے سمندر میں'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ اُن کی ادبی سرگرمیاں صرف افسانوں تک محدود نہ تھیں۔ اُن کی ادبی سرگرمیوں کا مفصل تذکرہ میں نے اُن کے تعلق سے مرتب کی گئی کتاب ''یادوں کا میکدہ'' کے پیش لفظ میں کیا ہے۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر حسین شاہ بھی قلم کار ہیں لیکن اُن کی تحریریں زراعت یا گالف سے تعلق رکھتی ہیں۔

اکثر اپنے ذہن کی کھڑکی کھول کر اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں ۔ میرا ماضی اَن گنت یادوں سے بھرا پڑا ہے۔ مٹھاس ، کڑواہٹ اور تلخیوں سے بھرپور یادیں، محبت کی دولت سے مالا مال یادیں ،جلن، نفرت اور خود غرضی کے پس منظر میں بھوکی اور پیاسی یادیں، علمی اور ادبی سفر کی راہ میں بکھرتی یادیں ، بہت ساری سندر سندر سی گلابی مہک سے بھرپور یادیں اور کانٹوں کے بوجھ سے جھُکی جھُکی بے ثمر یادیں، بچپن اور لڑکپن کی یادیں ، جوانی اور نوجوانی کی یادیں، تعلیمی زندگی سے وابستہ یادیں، ملازمت کی تلخ وشیریں یادیں، حاکمانہ اور محکومانہ یادیں، لامکانی کے حدود میں کبھی خود کو پانے اور کبھی خود کو کھونے کی یادیں، کشمیر کے پرآشوب دور کی یادیں، علم وادب اور خاص طور سے افسانوی ادب سے وابستہ گزشتہ پچاس برسوں سے زائد عرصے کی ڈھکی چھپی، چھوٹی بڑی، کامیاب اور ناکامیاب یادیں۔ میری اِن یادوں کی داستان بہت طویل ہے، اس داستان کے ایک ایک لفظ ، ایک ایک ورق پر میری نظریں ٹھہری سی گئی ہیں اور میں اپنے ذہن کے کنواس پر اپنی پہلی تحریر یا اپنے تخلیقی سفر کی پہلی تصویر دیکھ رہا ہوں۔

میری پہلی تحریر اُس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ ایس۔ پی ہائی اسکول کے دنوں کی بات ہے۔ اپنی اسکولی زندگی کی پہلی تحریر کو میں نے اسکولی کاپی پر قلم بند کیا۔ یہ ایک ڈراما تھا کاپی کے دس صفحات پر پھیلا ہوا۔ اِس ڈرامے میں صرف تین کردار تھے ۔ ایک نوکر، ایک عورت اور ایک سُنار۔ آپ کو جان کر حیرانی ہوگی کہ میری پہلی تحریر اردو میں نہیں بلکہ کشمیری میں تھی۔ ہمارے گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا اور اس ماحول کو پَروان چڑھانے میں میری والدہ محترمہ کا ہاتھ تھا۔ اُنہوں نے میری پہلی تحریر دیکھتے ہی لون صاحب سے ملنے کا مشورہ دیا۔ جی ہاں، میں مرحوم علی محمد لون کی بات کررہا ہوں جن کے اور ہمارے گھر کے درمیان دس پندرہ

فٹ گلی کا فاصلہ تھا۔ میں لون صاحب کے ہاں گیا اور اپنی کاپی اُن کو دے آیا۔ دوسرے تیسرے دن وہ اپنے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھامے اور دوسرے ہاتھ میں میری کاپی پکڑے ہمارے یہاں آئے اور کہا کہ اب یہ ڈراما اردو میں لکھو۔ میں نے کاپی لینے کی کوشش کی تو انہوں نے دینے سے انکار کیا اور کہا...... ''مجھے ترجمہ نہیں چاہیئے ۔ یہ ڈراما اردو میں اپنی یادداشت کے سہارے لکھو لیکن جلد بازی سے نہیں''۔ میں نے تین کرداروں والی کہانی کو اردو میں ڈرامائی روپ دیا اور لون صاحب کو دے آیا۔ روز و شب گزر گئے ۔ نہ لون صاحب نے کچھ کہا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی جرأت کی لیکن ایک دن صبح ہی ہمارے گھر آ گئے اور نمکین چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نور لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے اور پڑھنے کے لئے کتابوں کا ہونا ضروری ہے، میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا اور......!

اور کہا............

''تم کشمیری میں نہیں اردو میں لکھنے کی کوشش کرو۔''

اور پھر میں نے اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا اور آج تک میں اُردو میں ہی لکھتا آ رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے اِس بات کا بھرپور احساس ہے کہ کشمیری میری مادری زبان، میری شناخت ہے اور مجھے اپنی پہلی کشمیری تحریر پر فخر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے کئی کشمیری افسانوں کو اردو کا روپ دیا ہے اور ابھی بھی دے رہا ہوں۔ اِن میں سے کئی کہانیوں کے ترجمے رسائل و جرائد کی زینت بھی بنے ہیں۔

تعلیمی محاذ پر آگے بڑھتا رہا اور اسی طرح لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق کو بڑھاوا ملتا رہا۔ مختلف ادیبوں کے افسانے ، ناول اور دوسری تخلیقات پڑھنے میں میری دلچسپی بڑھتی رہی۔ ان ادیبوں میں ابن صفی بھی شامل تھے۔ اے۔ حمید کے رومانی افسانے پڑھتے وقت عجیب سی خوشی محسوس ہوتی۔ ابراہیم جلیس کی تحریریں بھی دلچسپی

سے پڑھتا تھا اور آہستہ آہستہ میرے لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق میں اضافہ ہوتا گیا۔ البتہ ترجیحات بدلتی رہیں، ترجیحات کے ساتھ کتابیں بھی بدلتی رہیں، قلم کار بھی بدلتے رہے، پڑھنے لکھنے کے انداز بھی بدلتے رہے۔ تھوڑے سے مطالعے اور اچھے خاصے مشاہدے کی بنا پر جب محسوس کیا کہ میں کہانیاں خود بھی لکھ سکتا ہوں تو ایک کہانی اردو دنیا کے نامور مدیر آنجہانی، خوشتر گرامی کے نام ارسال کی۔ بہت دنوں کے بعد جواب پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ ''آپ کی کہانی ہمارے معیار پر پوری نہیں اُترتی''۔ کہانی بھی واپس مل گئی۔ کچھ مدت بعد میں نے کہانی کا عنوان بدلا۔ شروعات اور اختتام پر ذراسی تبدیلی کے بعد دوبارہ خوشتر صاحب کو ارسال کی لیکن ایک اور تبدیلی کے ساتھ۔ کہانی کار نور شاہ اپنا رنگ و روپ بدل کر شاہدہ شیرین بن گیا تھا اور اس طرح اپنا نام بدل کر اور خاتون افسانہ نگار کا روپ اپنا کر میری پہلی کہانی ''گلاب کا پھول'' کے عنوان سے اس زمانے کے معروف ترین جریدہ ماہنامہ ''بیسویں صدی'' (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی۔ پہلی کہانی سے کشمیر کی شاہدہ شیرین کا نام مہک اُٹھا، کہانی اچھی تھی یا کہانی کار کا نام...... یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ پھر اسی نام سے بیسویں صدی میں ایک اور کہانی ''بن برسے بادل'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''شمع'' بھی اپنے عروج پر تھا۔ ''تلخی'' کے عنوان سے شاہدہ شیرین کا مختصر افسانہ شائع ہوا۔ خطوط آنے شروع ہوئے اور کتابوں کی صورت میں تحائف بھی آنے لگے۔ اس تعلق سے شاہدہ شیرین کو جو پہلا طویل خط ملا وہ آنجہانی ٹھاکر پونچھی کا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے میرے اوّلین افسانوی مجموعہ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے (سال اشاعت ۱۹۶۲ء)۔ میری یادوں سے ایک اور بھولی بسری یاد میرے ذہن کے نہاں خانوں سے باہر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں ریگل سنیما کے سامنے کھڑا تھا۔ دوسری جانب سے مرحوم پروفیسر شکیل الرحمٰن اور مرحوم پروفیسر حامدی کاشمیری آ رہے

تھے۔ میں نے ہاتھ ہلایا اور اُنہوں نے ہاتھ ہلا کر وہیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں سڑک پار کر کے میری جانب تشریف لائے۔ ہاتھ ملانے کے بعد حامدی صاحب نے شکیل صاحب سے کہا...... ’’آپ نے تو کہا تھا کہ شاہدہ شرین سے ملاؤں گا۔‘‘

’’ہاں ہاں، کہا تھا اور میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ پہلے نور شاہ سے اس کی خیر خیریت پوچھتے ہیں۔‘‘

’’خیر خیریت کی بات بھی ہوگئی۔‘‘ حامدیؔ صاحب نے پھر اپنی بات دہرائی۔

’’ارے حامدیؔ اتنی جلدی کیا ہے، تم تو شاہدہ شیرین سے ہی بات کر رہے ہو۔‘‘ حامدیؔ صاحب میری طرف دیکھتے رہے اور پھر بھر پور قہقہہ لگا کر مجھے گلے لگایا۔ یہ زنانہ مردانہ ناموں کی جانکاری شکیل صاحب کو چند روز قبل ہی دلی میں بیسویں صدی کے دفتر میں ملی تھی۔

ان ہی دنوں ویدراہیؔ ’’یوجنا‘‘ ہندی کے مدیر تھے۔ اُنہوں نے میری کہانی ’’بن برسے بادل‘‘ کا ہندی روپ میری تصویر کے ساتھ ’’یوجنا‘‘ میں شائع کیا اور پھر شاہدہ شیرین نے نور شاہ کا روپ اپنا لیا۔ شاہدہ شیرین کے نام آئے ہوئے اَن گنت خطوط کو میں ایک کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتا تھا لیکن مرحوم لونؔ صاحب نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ حال ہی میں اپنی ذاتی لائبریری میں مرحوم عابد مناوری کے شعری مجموعے تلاش کر رہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر ژواگو نامی ناول کا اُردو ترجمہ ملا۔ چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ یوسف صدیقی نے کیا ہے۔ میں یہ بات اس لئے دہرا رہا ہوں کہ شاہدہ شیرین کے لئے یہ کتاب حفیظ الکبیر صاحب نے اپنے دستخط کے ساتھ بطور تحفہ جنوری ۱۹۶۲ء ممبئی سے بھجوائی تھی۔ کبیر صاحب نے اِس کے ایک ورق پر جو محبت اور پیار بھرے الفاظ لکھے ہیں، وہ مجھ تک ہی رہنے دیجئے۔ ویسے بھی اُن کے

خطوط شاہدہ شیرین کے نام آتے رہتے تھے۔ البتہ میں یہ نہیں جانتا کہ اگر کبھی اُنہوں نے شاہدہ کے نور بننے کے تعلق سے سنا ہو تو اُن پر کیا بیتی ہو گی۔

اب میں نور شاہ کے نام سے مختلف رسائل میں شائع ہونے لگا اور اس طرح تخلیقی سفر پر چلتے چلتے مجھے ایک پہچان سی ملنے لگی۔

مجھے اس بات کا فخر ہے اور شاید یہ میری خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملک اور بیرون ملک کے بہت سارے رسائل اور جرائد میں پچاس برسوں سے میری کہانیاں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی آ رہی ہیں اور مجموعی طور پر پسند بھی کی جاتی ہیں۔

اپنے تخلیقی سفر کے آغاز میں رومانی کہانیاں لکھیں۔ کہانیوں کے کردار و واقعات رومانی تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچپن، لڑکپن اور جوانی ڈل جھیل کے رومانی کنارے اور کوہِ سلیمان کے رومانی دامن میں گزرا ہے۔ دور حد نظر تک برفیلی چوٹیوں، سبز نیلا پانی، رنگ برنگ کے پھولوں کی خوشبو اور دوسرے مناظر میرے ذہن میں بسیرا کئے ہوئے تھے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری اپنی سوچیں رومانی تھیں (اور شاید آج بھی)۔ آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ رومان کے پس منظر میں لکھے گئے میرے افسانے آج بھی بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں، آج بھی جب کبھی بیرونِ ریاست سے آئے ہوئے قلم کار یہاں کی ادبی نشستوں میں شرکت کرتے ہیں تو ضرور میری رومانی کہانیوں کا ذکر چھیڑتے ہیں اور اپنی پسندیدگی کا اِظہار بھی کرتے ہیں۔ ایک بار بارہمولہ (کشمیر) کی ادبی نشست میں عصمت چغتائی سے کسی نے کشمیر کے کہانی کاروں کے تعلق سے کچھ جاننے کی کوشش کی تو اُنہوں نے جواب میں کہا تھا۔ ’’میں نور شاہ کو پڑھتی ہوں۔‘‘ ٹھیک اسی طرح جب کرشن چندر سے کشمیر کے تعلق سے کچھ جاننا چاہا تو اُنہوں نے کہا تھا۔ ’’میں نے کشمیر کو پوری طرح

سے دیکھا ہی کہاں ہے۔ میں نے کشمیر کو حامدی کاشمیری اور نور شاہ کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔''

۱۹۶۲ء میں میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' شائع ہوا۔اس کا پیش لفظ آنجہانی ٹھاکر پونچھی نے قلم بند کیا ہے۔

جب میں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ترقی پسند ادیبوں کا اثر بہت حد تک باقی تھا۔ادھر ان دنوں اُردو ادب کے دروازے پر جدیدیت کی جادوگرنی بھی دستک دے رہی تھی۔ترقی پسند ادب سے میں نے کوئی شئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اگر اپنا لی ہے تو وہ بے انصافی اور استحصال کے خلاف بات کرنے کا حوصلہ۔ جدید ادب کے تکنیکی اور ہئیتی تجربوں سے بھی میں نے کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا ہے۔ مجھے شور سے پہلے بھی وحشت ہوتی تھی اور اب بھی ہور ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دھیمی آواز میں لہجے کو زیادہ یقین کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ یہ نرم نرم لہجہ تو میری کہانیوں کے کرداروں میں نظر آتا ہے۔ ویسے بھی مجھے سرگوشیوں میں بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں ہمیشہ محسوس کرتا ہوں کہ میری کہانیوں اور ناولوں کے کردار میرے بہت قریب رہتے ہیں اور میں ان کرداروں سے گھل مل جاتا ہوں۔اسی لئے دھیمی آواز میں بات کرنے کا قائل ہوں۔

اسی دور میں پشکر ناتھ نے بھی ''بیسویں صدی'' سے ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوتے تھے۔اُن سے میری ملاقاتیں باقاعدگی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ہماری دوستی کے نتیجے میں ہماری کوشش رہتی تھی کہ ہم دونوں کی کہانیاں مختلف رسائل میں ایک ساتھ شائع ہوں اور اکثر ایسا ہوا بھی ہے۔ کچھ معروف جریدوں میں کسی زمانے میں حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ اور نور شاہ شائع ہوتے تھے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ لکھنو سے مرحوم عابد سہیل ''کتاب'' نامی رسالہ شائع کرتے تھے۔ایک بار تو پشکر ناتھ کی کہانی میرے نام سے شائع ہوئی تھی۔

اس بات پر پشکر ناتھ نے کہا تھا۔ ’’رہنے دو میرے پیارے، کیا فرق پڑتا ہے۔‘‘......
لیکن میں نے ایک خط لکھ کر اس کی وضاحت کی تھی۔ یہاں میں، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس زمانے میں قلم کاروں کے آپسی رشتے قدرے نزدیک اور قریبی ہوتے تھے۔

رسالہ ’’کتاب‘‘ کے تعلق سے میری یادوں کی کتاب سے ایک اور ورق میرے سامنے بکھرنے لگا ہے۔ حالانکہ اس کا ذکر بعد میں آنا تھا لیکن میں معافی چاہتا ہوں اگر آپ کو میرے تخلیقی سفر میں پہلے کی بات بعد میں اور بعد کی بات پہلے نظر آئے۔

۱۹۷۲ء میں ماہنامہ ’’کتاب‘‘ کا افسانہ نمبر شائع ہوا تھا، اس افسانہ نمبر کی اشاعت سے پہلے ’’کتاب‘‘ کے چند شماروں میں ایک سوالنامہ شائع کیا گیا تھا۔ یہ سوالنامہ چھ سوالوں پر مشتمل تھا۔ ان میں ایک سوال یوں تھا۔

’’اگر آپ کو ایک ساتھ دس افسانوی مجموعے خریدنے ہوں تو آپ کن افسانہ نگاروں کے مجموعے خریدیں گے؟

اس سروے میں ۲۸۹ قارئین نے حصہ لیا تھا۔ اس سوال کا جواب افسانہ نگار کی مقبولیت کی جانب ایک واضح اشارہ تھا۔ سروے کے مطابق کرشن چندر کا نام سرِ فہرست تھا۔ باقی تفصیل یوں ہے۔ (۲۴۷)

سعادت حسن منٹو	۱۲۶	خواجہ احمد عباس	۹۱	احمد ندیم قاسمی	۱۰۱
پریم چند	۶۱	بلونت سنگھ	۵۸	علی عباسی حسینی	۶۵
رضیہ سجاد ظہیر	۴۱	واجدہ تبسم	۵۶	قاضی عبدالستار	۵۲
جوگندر پال	۵۷	جیلانی بانو	۹۲	رتن سنگھ	۵۷
کوثر چاندپوری	۷۹	اقبال متین	۵۹	شفیق الرحمان	۲۲
اے حمید	۲۸	عابد سہیل	۲۳	ممتاز مفتی	۱۱

الیاس احمد گدی	١٩	غلام عباس	٢٩	انور عظیم	٣۵
سہیل عظیم آبادی	٢٣	سریندر پرکاش	٢۴	حاجرہ مسرور	۴٢
نور شاہ	١٨	مظفر حنفی	٢۴	عوض سعید	١١
ستیش بترہ	٢٨	ابراہیم جلیس	١٧	کشمیری لال ذاکر	١٣
م۔ک۔مہتاب	١۴	بلراج مین را	١٢	احمد یوسف	٧
مبشر ناہید	٦	مہندر ناتھ	٩	عظیم واسطی	٣

اس سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ١٩٧٢ء میں بھی پڑھنے والوں یا ٢٨٩ قارئین کے ذہنوں میں میرا نام محفوظ تھا۔ مجھ سے بہتر اور مجھ سے سینئر افسانہ نگاروں کے مقابلے میں مجھے زیادہ ووٹ ملے تھے۔ یہ میرے تخلیقی سفر کے لئے ایک حوصلہ افزا بات تھی۔

اِس ضمن میں ایک اور بات یاد آرہی ہے۔ ایک ادبی نشست میں ایک معروف نقاد نے اپنے قد وقامت کا احساس دلاتے ہوئے مجھ سے پوچھا......''شاہ صاحب آپ کی کہانیاں بہت سارے جرائد میں نظر آتی ہیں، اِن میں سے کچھ جرائد معیاری ہیں اور کچھ غیر معیاری۔ آپ کو غیر معیاری جرائد کا انتخاب نہیں کرنا چاہیئے۔''

یہ ایک نیک مشورہ تھا یا ایک طنز......میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''جناب معیاری جرائد میں میری کہانیاں شائع ہونے سے میری کہانیوں کا معیار بڑھ جاتا ہے اور غیر معیاری جرائد میں میری کہانیوں سے ان جرائد کا معیار بڑھ جاتا ہے۔''

لکھنے پڑھنے کے تعلق سے کچھ ایسی یادیں میرے سامنے اُبھر رہی ہیں جن کا تعلق ماہنامہ ''دیہات سدھار'' سے ہے۔ میں جموں وکشمیر کھادی اینڈ ولیج انڈسٹری میں بطور فیلڈ آفیسر کام کر رہا تھا کہ مرحوم صادق صاحب نے مجھے ماہنامہ ''دیہات

سدھار'' کا مدیر تعینات کرنے کے تعلق سے احکامات جاری کیئے۔اس پوسٹ پر مرحوم عشرت کشتواڑی کام کر رہے تھے،انہوں نے چند ماہ قبل ہی از خود سرکاری ملازمت سے سبکدوش لی تھی اور سیاسی میدان میں اُترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ فروری ۱۹۶۷ء کی بات ہے ۔ میں اب ایک گزیٹیڈ پوسٹ پر تعینات ہو چکا تھا ۔ یہ اطلاع مجھے پہلے میرے ایک قریبی دوست آنجہانی بنسی سپرو نے دی اور بعد میں اس کی تصدیق صادق صاحب کے سیکورٹی آفیسر حفیظ صاحب نے بھی کی ۔ دفاتر جموں میں تھے، میں جموں چلا گیا۔ نور محمد صاحب ایگریکلچر پرڈکشن کمشنر تھے۔''دیہات سدھار'' کی اشاعت کے دوران میری کہانیاں لکھنے کی رفتار میں کسی حد تک کمی آئی اور میں نور محمد صاحب کی ہدایات کے مطابق زرعی پروگراموں کے تعلق سے مضامین لکھنے لگا۔اس دورا ن بے شمار زرعی پمفلٹ شائع ہوئے ۔ بعد میں پنجابی اور اردو زبان کے معروف کہانی کار خالد حسین اور معروف ڈوگری شاعر تارا اسماعیل پوری نائب مدیران تعینات ہوئے اور اُن کی آمد سے میرے افسانے لکھنے کی رفتار نے ایک بار پھر تیزی پکڑی۔ اُن کی تعیناتی سے پہلے کی بات ہے ۔ایک روز دفتر جاتے ہی مجھے سیکرٹری جنرل ڈیپارٹمنٹ جناب صفایا صاحب کا بلاوا آیا۔ میں اُن کے کمرے میں گیا، وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ کہے بغیر وہ مجھے چیف سیکرٹری آغا مظفر صاحب کے چیمبر میں لے گئے ۔ چیف سیکرٹری صاحب نے صفایا صاحب اور مجھے وزیر اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کے شاندار کمرے میں لیا۔

بیٹھیئے اور لکھیئے ۔ شیخ صاحب نے مجھ سے کہا۔''میں جو Dictate کروں گا اس کی کتابت کروا لیجئے اور پھر اس کی کاپیاں نکال کر مجھے کیبنٹ روم میں دیجئے۔''

یہ حلف نامہ وزیر اعظم کے نام تھا اور اس پر دستخط کرنے والے اُن کے وزرا تھے اور اس میں شیخ صاحب کے تیئں اپنی وفاداری کا بھر پور اظہار کرانا واحد مقصد تھا۔

میں نے حکم کی تعمیل کی اور جب کا پیاں بنا کر کیبنٹ روم میں گیا اور ایک ایک کاپی میٹنگ میں حاضر وزیروں کے سامنے رکھی۔ حالانکہ قریب قریب سارے وزیر مجھے جانتے تھے۔ دوسرے دن سارے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ شیخ صاحب کے تیئں ریاستی وزیروں نے اپنی وفاداری کا اِظہار ایک حلف نامہ کی صورت میں ذاتی طور پر شیخ صاحب کو پیش کیا۔اس حلف نامہ کے تعلق سے مرحوم شمیم احمد شمیم نے ''آئینہ'' میں ایک بڑا مضمون لکھا اور اپنے مخصوص طرز تحریر سے اس کا پوسٹ مارٹم کیا۔ یہ کام مجھے مدیر ''دیہات سدھار'' کی وجہ سے ملا تھا۔حلف نامہ کی زبان انگریزی نہیں بلکہ اُردو تھی......شاید اسی وجہ سے۔''

اِس تعلق سے ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ جب شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے سیاسی تعلقات بگڑنے لگے اور ایک روز بیگ صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ کمرے میں اکیلے تھے ،انہوں نے اردو میں ایک خط لکھوانا شروع کیا۔خط مکمل ہونے کے بعد انہوں نے کہا ''میں آج ہی دلی جارہا ہوں۔ یہ خط بغیر کسی ترمیم واضافہ کے کل کے اخبار'' آفتاب'' میں شائع ہونا چاہیئے ۔البتہ خط لکھنے والے کا کوئی عام سا نام لکھ دینا اور کل کا'' آفتاب'' مجھے دلّی میں ملنا چاہیئے ۔اس خط کا موضوع '' سیاسی آوارگی'' تھا۔خط دوسرے روز اخبار'' آفتاب'' میں شائع ہوا لیکن مدیر'' آفتاب'' خواجہ ثناءاللہ بٹ کے اِس جملے کے ساتھ کہ'' یہ خط میرے دفتر میں کوئی لڑکا دے گیا لیکن لگ رہا ہے کہ اِس خط کے ذریعہ بیگ صاحب نے سیاسی آوارگی کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے واقعی یہ خط اپنے کسی رشتہ دار لڑکے کو دفتر'' آفتاب'' میں دینے کے لئے کہا تھا۔ چندروز بعد جب بیگ صاحب دلی سے لوٹ آئے تو سیاسی حالات کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے تھے۔اگر یہ خط انگریزی زبان میں لکھا گیا ہوتا تو شاید میری ضرورت نہ پڑتی۔

مجھے ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔جموں وکشمیر میں پنچایتی اِنتخابات کی بات چل رہی تھی ۔اعلیٰ سطح پر یہ فیصلہ لیا گیا کہ پنچایتی کانفرنسوں میں وزرا اپنی تقریر پڑھ کر سنائیں گے تاکہ سرکاری پالیسی کے خلاف کوئی بات نہ کہی جائے۔ایک بار شیخ صاحب، بیگ صاحب اور محمد اشرف خان کو ریاسی میں ایک بہت بڑی پنچایت کانفرنس میں شرکت کرنا تھی۔ مجھے اس کانفرنس کے تعلق سے سب کے لئے تقریریں لکھنا پڑیں ۔اس کانفرنس میں دوسرے سرکاری آفیسروں کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔اُن دنوں گلکار صاحب ڈائریکٹر انفارمیشن ہوا کرتے تھے ۔کانفرنس ختم ہونے کے بعد گلکار صاحب نے مجھ سے کہا۔

''مبارک ہو''

''کس لئے''

'' تقریریں اچھی تھیں لیکن اِن میں افسانوی رنگ جھلک رہا تھا۔اب تو مزید وضاحت کی ضرورت نہیں......''

اِن تقاریر میں شاید سیاست کم تھی اور افسانہ نگاری کچھ زیادہ !!

میرے ذہن میں پوشیدہ سوچوں کی تہہ سے سول سیکرٹریٹ کے کمروں کی تصویریں اُبھر رہی ہیں اور یہ تصویریں مجھے کچھ یاددلا رہی ہیں۔اگر چہ یہ یادیں میرے سرکاری سفر سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کا اِظہار اس لئے ضروری ہے کہ ان کے پس پردہ اردو کا کردار ہے اور اردو میرے ادبی سفر کی ساتھی ہے۔سیکرٹریٹ میں مجھ سے بہتر اردو لکھنے اور سمجھنے والے افراد موجود تھے۔قابل بھی تھے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اُن کی نظر بلاشبہ بڑی وسیع تھی۔لیکن میری افسانوی تخلیقات نے مجھے سیکرٹریٹ کے اندر باہر ایک الگ سی پہچان دینے میں مدد کی تھی اور سیکرٹریٹ گیٹ سے لے کر وزیر اعلیٰ کے چیمبر تک سب مجھے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے

۔افسانہ نگاری کی وجہ سے سیکرٹریٹ میں کچھ لوگ مجھے ہرفن مولا سمجھنے لگے تھے۔اس ’’ہرفن مولا‘‘ کی وجہ سے مجھے کبھی کبھی خود بے جا پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔اسی پس منظر میں مجھے ایک دِن ریونیو ایکٹ کا ترجمہ کرنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے وہ ایکٹ دو تین بار پڑھا تو میرے پسینے چھوٹ گئے ۔ اس ایکٹ میں اتنی تکنیکی اصلاحات تھیں جو میری جانکاری سے بالاتر تھیں۔شاید مجھے ڈکشنری میں بھی نہیں ملتی لیکن اُن کو اردو روپ دینا ضروری تھا۔خوش قسمتی سے مرحوم نور محمد بٹ سیکرٹریٹ میں نظر آئے۔ میں نے اُنہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ وہ میرے ساتھ میرے کمرے میں آئے اور شام گئے تک ترجمہ کرنے میں مدد کرتے رہے۔جب وہ مطمئن ہوئے تو تشریف لئے گئے۔نور صاحب ایک بہت ہی اچھے مترجم تھے۔

اب اس کے برعکس کی کہانی سناتا ہوں۔مسٹر آر۔سی۔ بھارگو زراعت کے کمشنر تھے اور پنڈت ترلوچن دت وزیر زراعت۔ بھارگو صاحب ایک سلجھے ہوئے بیوروکیٹ تھے۔ڈسپلن کے بہت زیادہ پابند۔اُن کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اُن کے کمرے میں کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔میں نے بڑے بڑے آفیسروں کو ان کے کمرے میں جانے سے پہلے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اور اپنی ٹائی کی گرہ کو ٹھیک کرتے دیکھا ہے۔میں اُن کے ماتحت کام کرنے والوں میں بس واحد آفیسر تھا جس کو بغیر پوچھے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت تھی۔اس کی ایک وجہ تھی کہ اردو تو وہ بول سکتے تھے اور شاید مجھ جیسے اردو بولنے والوں سے بہتر لیکن نہ وہ اردو لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے۔اردو میں انہیں بہت ساری درخواستیں اور چھٹیاں ملتی تھیں۔اُردو کے تعلق سے اُن کی ساری ڈاک میرے پاس آتی تھی۔اُن کا ترجمہ کرنا میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ ہر روز ترجمہ شدہ مواد کی ایک الگ فائل اُن کے ٹیبل پر موجود رہتی تھی۔وہ انگریزی ترجمہ پڑھتے اور الگ الگ سے اپنے احکامات صادر فرماتے۔ بھارگو

صاحب کے مقابلے میں محمود الرحمٰن صاحب اُردو زبان کی باریکیوں سے کافی حد تک واقف تھے۔اردو زبان کے تعلق سے میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

پھر میری سرکاری تعیناتیاں بدلتی رہیں، ترقیاں ملتی رہیں، کبھی سیکرٹریٹ کے اندر اور کبھی سیکرٹریٹ سے باہر۔کچھ دیر تک میری ادبی سرگرمیاں رُک بھی گئیں لیکن میرے اندر کا افسانہ نگار زندہ رہا اور اس طرح میرا تخلیقی سفر آگے بڑھتا گیا......!

اپنے تخلیقی سفر کے دوران بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری ادبی اور علمی تنظیموں سے وابستہ رہا ہوں اور یہ سفر آج بھی رواں دواں ہے۔

جموں وکشمیر رائٹرس کواپریٹیو سوسائٹی کا قیام ۱۹۷۰ء میں عمل میں لایا گیا۔اس کی افتتاحی رسم شہر کے بہت بڑے ہوٹل ''نیڈوز ہوٹل'' میں انجام دی گئی۔اس سوسائٹی کے قیام کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ ریاست بھر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، قلم کاروں، فنکاروں اور موسیقاروں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کیا جائے بلکہ اُن کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا بھی ازالہ کرنے میں مدد کی جائے۔ریاست کے تینوں خطوں کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔کتابوں کی اشاعت اور فروخت کے لئے مناسب اقدامات اُٹھائے جائیں۔کتابوں اور تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرنا سوسائٹی کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔اس کا ایک باقاعدہ آئین اور دفتر تھا۔یہ دفتر بابا بلڈنگ، بنڈ سری نگر میں قریب قریب ہر روز بعد دوپہر کھلتا اور شام دیر گئے تک کھلا رہتا۔میں اس تنظیم کا ایک سرگرم رُکن تھا اور موسم گرما میں دفتری اوقات کے بعد روز یہاں حاضر ہوتا تھا۔یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ دربار مو کے دوران مجھے ملک کے نامور قلم کاروں سے ملنے کے مواقع ملتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ میرے ادبی دوستوں کی فہرست طویل تر رہی ہے اور اس میں ہر زبان وادب کے نام اور چہرے نظر آئیں گے۔میں بات کر رہا تھا جموں وکشمیر رائیٹرس کواپریٹیو سوسائٹی کی، ادبی اور علمی مجلسوں کی

اس سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ راما نندساگر جب بھی کشمیر آتے تو ہم لوگوں سے ملنے بابا بلڈنگ ضرورتشریف لاتے۔ یہاں ٹھاکر پونچھی نے اپنا ناولٹ ''یہ من بڑا چنچل'' پڑھا۔ایک ہی نشست میں سنا کرسب کو چونکا دیا تھا۔ ایک محفل میں رضیہ سجاد ظہیر نے اپنا ایک طویل افسانہ ''اللہ دے بندے'' پڑھا تھا اور مجھ سے بھی ایک کہانی سنی تھی جو بعد میں مرحومہ نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''اردو افسانے'' میں شامل کی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۷۴ء میں نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں میری شمولیت سے میری عزت افزائی ہوئی کیوں کہ خواجہ احمد عباس، رتن سنگھ، سہیل عظیم آبادی، واجدہ تبسم، اقبال متین، جوگندر پال اور قرۃ العین حیدر کی کہانیوں کے درمیان میری کہانی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔اس طرح میری ادبی حوصلہ افزائی مختلف مرحلوں پر ہوتی رہی ۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ غلام رسول سنتوش نے بابا بلڈنگ کے ایک کمرے کو سٹیڈیو میں تبدیل کرلیا تھا اور اکثر اپنی انمول تصویروں کی تخلیق میں مصروف نظر آتے۔ پہلی کشمیری فلم ''مانز راتھ'' کی کہانی، مکالمے اور گیت اسی ادبی ماحول کی دین ہیں۔

اُن محفلوں کی اہمیت بھی کبھی کم نہ تھی جو محکمہ انفارمیشن کے بڑے ہال میں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ اِن کا اہتمام مرحوم شمیم احمد شمیم کرتے تھے۔ میں ان محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا ۔ یہاں ایک اور بات عرض کروں کہ کشمیر میں مشاعروں کا انعقاد بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے ۔ مقامی اور غیر مقامی شعرا ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔جب مرحوم شمیم صاحب حیات تھے تو میں اُن کے قریب بیٹھتا تھا۔مقصد یہ تھا کہ شعرا کے کلام کے ساتھ نزدیکی سے مرحوم کے مزاحیہ اور طنزیہ جملوں سے اپنے آپ کو محظوظ کرسکوں ۔اس زمانے میں مرحوم قیصر قلندر صاحب کے گھر پر ہر اتوار کو ادبی اور علمی محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا۔تب وہ کرن نگر، سری

نگر میں رہتے تھے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ اِن محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔اگر میں رگھوناتھ بازار جموں میں کتابوں کی اس دکان کا تذکرہ نہ کروں تو اس کے مالک آنجہانی راجندر ملہوترہ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔راجندر صاحب میرے اچھے دوستوں میں تھے اور مجھے اُن کی دکان بلکہ اُن کے گھر میں بھی رکھی کتابیں اپنی مرضی سے لینے، پڑھنے اور پھر اپنی جگہ پر رکھنے کی اجازت تھی۔اِن کتابوں نے میرے ذوق وشوق کو نکھارا اور لکھنے کے تعلق سے میری ذہنی قوت کو کشادہ کیا۔جموں میں ہی ٹورسٹ رسپشن سینٹر کے قریب شاردا کارنر نامی کتابوں کی ایک اور دکان تھی۔اس کے مالک سہگل جی ہوا کرتے تھے۔وہاں بھی پڑھنے کے لئے کتابیں دستیاب ہوتی تھیں۔سہگل جی نے پبلشنگ کا کام بھی شروع کیا تھا۔میرے ناول ''نیلی جھیل، کالے سائے '' کے علاوہ انہوں نے مرحوم علی محمد لون کا ناول ''شاہد ہے تیری آرزو'' اور موہن یاور کی ترتیب دی ہوئی کتاب ''توی اور جہلم'' کو منظر عام پر لانے کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی تھیں۔ٹھیک شاردا کارنر سے چند قدم آگے ایک اور صاحب (نام یاد نہیں آرہا ہے) سڑک کے ایک کنارے ایک بڑی سی چادر پر کتابیں سجائے کتابوں کو کرائے پر دے کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔وہاں بھی کتابیں دستیاب ہوتی تھیں۔

میرا تخلیقی سفر جاری ہے اور اس تخلیقی سفر کو آگے لے جانے کی بجائے میں ایک بار پھر اپنے ماضی کی جانب جھانک رہا ہوں۔مجھے اس کا ذکر پہلے ہی کرنا چاہیئے تھا لیکن کبھی کبھار سوچیں ساتھ نہیں دیتی ہیں۔یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں نے پہلی بار ریڈیو ڈراما لکھنے کی کوشش کی۔میں نے اپنی ہی ایک کہانی ''دل کی روشنی'' کو ڈرامائی روپ دیا اور مسودہ علی محمد لون صاحب کے حوالے کیا۔چند دنوں بعد انہوں نے مجھے پران کشور جی سے ملنے کے لئے کہا۔میں پران جی سے ملا۔پران جی نے یہ ڈراما دوبار نہیں بلکہ تین بار نئے سرے سے لکھوایا اور تب ریڈیو سے میرا پہلا ڈراما نشر ہوا۔

یہ میرے تخلیقی سفر کی ابتدا تھی اور اس کے بعد میں تواتر کے ساتھ ریڈیو ڈراما لکھتا آرہا ہوں ۔ میرا خیال ہے کہ اب تک میں سو سے زائد ریڈیو ڈرامے لکھ چکا ہوں ۔ یہ سارے ڈرامے نشر بھی ہو چکے ہیں ۔ ڈرامہ لکھنے کے تعلق سے میرا سفر اب بھی جاری ہے ۔ چند ریڈیو ڈرامے میری کتابوں میں بھی شامل ہیں ۔ ریڈیو ڈراما لکھنے کے تعلق سے چند برس قبل مجھے ریڈیو کشمیر (اب آل انڈیا ریڈیو) سے ایوارڈ بھی ملا ہے ۔ اُس زمانے میں بشیر عارف صاحب ریڈیو کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے ۔

چوں کہ میری ملازمت کے بہت سارے ماہ و سال سول سیکرٹریٹ سے وابستہ رہے ہیں اس لئے ہر سال چھ ماہ سری نگر اور چھ ماہ جموں میں گزارنے کا پابند تھا ۔ جموں میں رہ کر میرے ذوق وشوق کو نئی نئی راہوں سے ہم کنار ہونے کے مواقع ملے اور میں وہاں کی ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتا رہا اور فیض اٹھاتا رہا ۔ جموں سے تعلق رکھنے والے میرے دوستوں کی تعداد بھی کافی تھی ۔ جموں کے قیام کے دوران اُن سے ملنا جلنا ہوتا تھا ۔ محفلیں جمتی تھیں ۔ کچھ ادیب اور علم دوست تو یہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے جو حیات ہیں اُن سے آج بھی رابطہ ہے ۔ کشمیری پنڈت کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے قلم کار جنہیں کشمیر سے باہر جانا پڑا آج بھی تخلیقی سفر میں میرے ہم سفر ہیں ۔ اُن کی یادیں، اُن کی باتیں آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں ۔ یہ دوطرفہ ٹریفک ہے وہ بھی مجھے یاد کرتے ہیں، میرا ذکر کرتے ہیں اور کبھی کبھار ملنا بھی ہوتا ہے ۔ اگر چہ ملنا جلنا اور ملاقاتیں محدود ہو کر رہ گئی ہیں کیوں کہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد میرا جموں جانا بہت کم ہو گیا ۔ میرے لئے بیتے دِنوں کی یادوں سے فرار حاصل کرنا ہر گز ممکن نہیں ۔

اگر دیکھا جائے تو میرے تخلیقی سفر میں کوئی تسلسل نہیں ۔ آج کی بات کل کے حوالے سے کرتا ہوں اور کل کی بات آج کے کھاتے میں ڈالتا ہوں ۔ اسی آج کل

کے دائرے میں آل انڈیا اردو کانفرنس کے مختلف مناظر آنکھوں کے سامنے آنے لگے ہیں۔اس اہم اردو کانفرنس کا اہتمام ممبئی میں ہوا تھا اور ماہ وسال میرے ذہن سے اُتر چکے ہیں۔ میرے علاوہ اس کانفرنس میں شمیم احمد شمیم، غلام رسول سنتوش، موہن یاور اور عابد مناوری بھی سرکاری طور پر نامزد ہوئے تھے۔اس کانفرنس کی صدارت اندرا گاندھی جی نے کی تھی اور کرشن چندر نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا تھا۔کرشن چندر نے اپنے خطبہ اِستقبالیہ میں میرا اور میری کہانیوں کا ذکر کشمیر کی خوبصورتی کے پس منظر میں کیا تھا۔ یہ میرے لئے بڑی حوصلہ افزبات تھی۔

اردو تنظیموں کے قیام کے تعلق سے جموں وکشمیر اردو اکادمی کی ادبی سرگرمیوں اور کارکردگیوں کا ذکر بے حدضروری ہے۔اگر چہ اس تنظیم کا قیام ۲۰۰۶ءمیں عمل میں لایا گیا تھا لیکن یہ ۲۰۱۰ءمیں سرکاری طور پر رجسٹر کی گئی۔ میں اردو اکادمی کا دس سال تک صدر رہا۔اس کا اپنا ایک اردو جریدہ ماہنامہ ’’اردو اکادمی‘‘ کے نام سے شائع ہوتا رہا اور میں اس کا مدیر بھی تھا۔اردو زبان وادب کی خدمت اس تنظیم کا واحد مقصد تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے اکادمی ان گنت ادبی محفلوں، مشاعروں ، بحث ومباحثہ، مذاکرات، کتابوں اور تصویروں کی نمائشوں اور مختلف ثقافتی پروگرام کی ترتیب وتہذیب میں ایک نمایاں رول ادا کر کے سرکاری اور غیر سرکاری سطحوں پر ایک نمایاں نام کما لیا۔میرے تخلیقی سفر میں اردو اکادمی کا قیام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۲۰۱۴ءمیں فکشن رائٹرس گلڈ کی بنیاد پڑی۔سرکاری طور پر گلڈ رجسٹر ہو چکا ہے۔فکشن کی آبیاری اس کا ایک اہم بلکہ واحد مقصد ہے۔جموں وکشمیر کا قریب قریب ہر فکشن نگار اس تنظیم سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا باقاعدہ ایک صدر دفتر ہے جہاں پر ہر سنیچر کو فکشن کے تعلق سے نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔فکشن کے لحاظ سے یہاں زبان وبیاں کی کوئی بندش نہیں ہے۔ ہر زبان کے فکشن کو بڑھاوا دینا وقت کی ضرورت

ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گلڈ ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ وحشی سعید اس کے سرپرست ہیں۔ گلڈ کے چار مشیر ہیں۔ جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر احمد کرمانی، نور شاہ، خالد حسین اور اسفندیار خان۔ گلڈ کی نشستوں میں، میں بھی کبھی کبھار اپنی کہانیاں سناتا ہوں اور گلڈ کے ممبران کے تاثرات سے مستفید ہوتا ہوں۔ یہاں فکشن کے تعلق سے گفتگو ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہانی کاروں کو اس تنقیدی گفتگو سے اپنی کہانیاں بہتر طور سجانے اور سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔

''نگینہ انٹرنیشنل'' صرف ایک رسالے کا نام نہیں بلکہ کشمیر سے باہر بھی اردو دنیا میں ایک تحریک بن کر سامنے آچکا ہے۔ ۲۰۱۴ء میں اس کی اشاعت نو کا سلسلہ شروع ہوا۔ تب سے میں اس کے ادارتی مجلس کا ایک رکن ہوں۔ دوسرے اراکین میں مظفر ایرج اور ڈاکٹر اشرف آثاری قابلِ ذکر ہیں جبکہ معروف افسانہ نگار وحشی سعید ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے مدیر و مالک ہیں۔

تخلیق کار کی زندگی میں انعامات و اکرامات کے امکانات کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ میرے تخلیقی سفر کے دوران اب تک مجھے بہت سارے انعامات و اکرامات سے نوازا گیا ہے۔ ان کی تعداد تیس سے زائد ہے۔ حالِ ہی میں مجھے ۲۰۱۹ء کا سٹیٹ ایوارڈ بھی ملا۔

مجھے اس بات کی خوش ہے کہ جموں و کشمیر اور لداخ میں دسویں جماعت کے طلاب میرے نام سے واقف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے میری کہانی ''آسمان، پھول اور لہو'' دسویں جماعت کے اردو نصاب میں شامل ہے۔ یہ میرے تخلیقی سفر کی ایک اہم کڑی ہے۔

میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ گزشتہ تیس برسوں کے دوران قلم کاروں کی ایک نئی نسل اُبھر کر آ رہی ہے۔ یہ قلم کار اپنے اسلوب سے شعری اور نثری ادب کی آبیاری

میں مصروف ہیں۔اسی طرح لڑ کے لڑکیوں کی ایک اچھی تعداد اردوزبان وادب کے تعلق سے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کر رہی ہیں۔ اِن کی مدد کرنا، اُن کی رہنمائی کرنا اور اُن کے مطالعے کے لئے کتابیں اور مواد فراہم کرنا اب میرے ادبی سفر کا ایک حصہ ہے۔

میں اس وقت شاید جموں وکشمیر اور لداخ کا واحد افسانہ نگار ہوں جس کے نام اور کام پر آٹھ طلاب کو ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئی ہیں۔

۱) افسانوی مجموعہ۔گیلے پتھروں کی مہک امتیاز احمد جموں یونیورسٹی

۲) نورشاہ اور اس کے افسانے سدیش کمار جموں یونیورسٹی

۳) نورشاہ کی ناول نگاری نزاکت حسین جموں یونیورسٹی

۴) آسمان پھول اور لہو۔افسانوی تجزیہ سمیر احمد مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد

۵) نورشاہ کی ادبی خدمات اشفاق احمد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد

۶) نورشاہ کی افسانہ نگاری شیراز احمد برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

۷) جموں وکشمیر میں اردو افسانہ
''نورشاہ کے حوالے سے'' فاروق احمد وانی برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

۸) نورشاہ......افسانہ نگاری
اور ناول نگاری کے پس منظر رتیش کمار جموں یونیورسٹی

میرے قریبی دوست کہتے ہیں آج کل میری تحریر کردہ کہانیوں میں رومانیت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رومانیت کی کوئی عمر نہیں ہوتی اور کبھی کبھار زندگی کی اندر کی کتاب کی نقاب کشائی کہانی کار کو ذہنی طور پر سکون بخشتی ہے اور وہ یہ سکون اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ بانٹنا چاہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ میری بات سے اتفاق رکھتے ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ رومان

بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔آپ رومانیت کے پس منظر میں میری کہانیوں کو کس انداز سے دیکھتے ہیں، یہ آپ کا کام ہے۔قلم کار تو آپ کے پڑھنے اور پرکھنے کے لئے یا آپ کی سوئی ہوئی سوچوں میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے مواد فراہم کرتا ہے......!!

تخلیقی سفر کے دوران میری کہانیاں اَن گنت رسائل اور جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں جن کی تعداد 60 سے زائد ہے،جن میں سے بہت سارے رسائل بند ہو چکے ہیں۔

اخبارات میں بھی کبھی کبھار میرے افسانے/ افسانچے شائع ہوتے رہتے ہیں۔لیکن کشمیر عظمیٰ کا ذکر خصوصی طور سے کرنا چاہوں گا۔افسانوں کے علاوہ میرا ایک ادبی کالم بھی کئی سال تواتر کے ساتھ میں شائع ہوتا رہا۔

میرا تخلیقی سفر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے چاہنے والوں کی محبت اور شفقت سے ابھی جاری ہے۔اگر صحت ٹھیک ہی اور قلم نے ساتھ دیا تو شاید کبھی آنے والے دِنوں میں اپنے تخلیقی سفر کی ایک اور کہانی میں سنا سکوں گا۔یار زندہ صحبت باقی!

●●●

(نور شاہ صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ اردو، جلد 57، نمبر 12-10 سے ماخوذ ہے، جو 2019 میں شائع ہوا ہے۔ادارہ)

☆......وحشی سعید

کاغذ بکھر رہے ہیں پُرانی کتاب کے

اپنے تخلیقی سفر کا تذکرہ کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرا تعلق کشمیر کے ایک معزز خاندان سے ہے جس کا سلسلہ مرحوم عظیم الدین ترنبو سے ملتا ہے جو افغانستان کے بدخشاں صوبے سے ہجرت کر کے غالباً پٹھانوں کے دور میں کشمیر آئے تھے۔ وہ تجارت سے وابستہ تھے۔ تجارت کا یہ سلسلہ نسل درنسل ہماری روزی روٹی کا سلسلہ بنتا گیا اور اب تک اللہ کے فضل وکرم سے قائم ودائم ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر پہلو میں ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ بدلاؤ آتے رہتے ہیں۔ ترمبو فیملی کے اراکین بھی ان ترجیحات کا حصہ بنتے رہے۔ اس بدلاؤ کو اپناتے رہے، تجارت کے طور طریقے بدلتے رہے لیکن تجارت کے پسِ منظر میں بھی ترنبو گھرانہ تعلیم کے نور سے مالا مال رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے والدین اس اصول کے سخت پابند تھے کہ ’’پہلے پڑھو لکھو اور پھر تجارت میں ہاتھ ڈالو‘‘۔ اس لئے ہمارے والد مرحوم محمد عبداللہ ترنبو اور ہماری والدہ مرحومہ سارہ ترنبو کے تینوں بیٹے محمد سعید ترنبو، ظہور احمد ترنبو اور عبدالمجید ترنبو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد محترم کی تجارت میں ہاتھ بٹانے لگے۔ میں نے کشمیر یونیورسٹی سے ایم، اے کیا۔ یونیورسٹی کے دور میں مجھے پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور پروفیسر حامدی کاشمیری کی رہبری ملتی رہی۔ ظہور صاحب نے M.Tech کی ڈگری حاصل کر لی اور عبدالمجید صاحب بھی اعلیٰ قانونی ڈگری حاصل کر چکے ہیں لیکن وہ اپنے خاندانی بزنس سے دست بردار

ہو گئے۔ وہ وکالت کے پیشے سے جُڑ گئے اور ان دنوں لندن میں ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ میں اور ظہور صاحب والدِ محترم کی وفات کے بعد ہوٹل شہنشاہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں مصروف ہوئے۔ظہور صاحب کے بارے میں بتانا چاہوں گا کہ وہ ادب دوست ہیں اور ادب نواز بھی۔ بہت سارے شعراء کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کے ساتھ رسولؔ میرا اور حبہ خاتون کے اشعار گنگناتے رہتے ہیں۔ محفلوں اور مجلسوں میں ان اشعار کی بدولت خوب داد حاصل کرتے ہیں۔

میرا افسانہ نگار بننے کا سلسلہ بھی کچھ دلچسپ واقعات سے خالی نہیں۔ میرے بچپن کے ایک دوست اپنے والد صاحب کے افسانے مجھے سناتے تھے۔ میری فطرت بچپن سے ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ کوئی بھی چیلنج جو مجھے بھاتا ہے میں اُسے پورا کرنے کے لئے بضد ہو جاتا ہوں۔ میرے دماغ میں خیال آیا کہ جب میرے دوست کے والد صاحب افسانہ لکھ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟! بس اس کے بعد افسانہ لکھنے پر کمر بستہ ہو گیا۔ یہ ذوق عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا، اس وقت اردو رسائل بہت کم نکلتے تھے لیکن جو بھی شائع ہوتے تھے اُن کی بہت اچھی دھوم تھی۔ کالج جانے کے زمانے میں ہی مجھے ''نگینہ'' نکالنے کا خیال آیا۔ اس میں میرے دونوں بھائی میرے ساتھ شانہ بہ شانہ تھے۔ امی جان جن کو ہم ''بوبا'' کہتے تھے، کو ہمارا یہ ادبی مشغلہ بہت پسند آیا اور انہوں نے ہماری ہر طرح سے معاونت فرمائی۔ مالی تعاون جو رسالے کی اشاعت کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہوتا ہے، وہ اب حل ہو چکا تھا۔ ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ میں شہر سے باہر تھا اور میرے دونوں بھائی اور ان کے دو پنڈت دوست زنانہ کالج کی دیوار پر رات کے وقت ''نگینہ'' کا اشتہار چسپاں کر رہے تھے کہ پولیس نے انہیں مشتبہ جان کر گرفتار کر لیا۔

میرے بھائیوں اور دوستوں نے لاکھ منت سماجت کی، دلائل پیش کئے لیکن سب بے سود اور ادب سے محبت کے صلے میں وہ رات انہیں حوالات میں گزارنا پڑی اور صبح ہی ان کی رہائی ممکن ہوسکی۔ یہاں بتانا چاہوں گا کہ تجارت کے سلسلے میں مجھے بیرونِ ملک جانے کے بہت مواقع ملتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ میں بہت سارے ممالک گھوم پھر چکا ہوں، ان ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران جو تجربات ہوئے وہ میرے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں اردو کے معروف شاعر مظفر ایرج ہم سے منسلک ہوگئے۔ یہ فطرت ہے کہ اگر چار ستونوں پر کھڑی عمارت کا ایک ستون بھی کمزور ہوجائے یا ڈھ جائے تو عمارت مکمل نہیں رہتی۔ ہم تین بھائی اور مظفر ایرج ''نگینہ'' کے چار ستون تھے۔ ''نگینہ'' کے علاوہ اس دور میں کوئی ایسا رسالہ نہ تھا جس میں میرے افسانے شائع نہ ہوتے ہوں۔ ان دنوں میں وحشی سعید کے ساتھ ساحل لکھتا تھا۔...... ''وحشی سعید ساحل''......اس دور میں ہمارے دوست مرحوم حکیم منظور بھی ہمارے ہم سفر تھے اور ادب کے تعلق سے اُن سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ان کے مفید مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ شعر و شاعری میری والدہ کو بہت پسند تھی۔ وہ دن یاد آرہے ہیں جب ہمارے گھر میں چھٹیوں کے دنوں صبح سے شام تک اور عام دنوں میں شام سے رات گئے تک افسانہ نگاروں اور شاعروں کا جمِ غفیر لگا رہتا تھا اور شعر و شاعری اور افسانہ نگاری ہوتی رہتی تھی اور میری والدہ ان محفلوں کو عزت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور ہمارا حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ ایک دن میں دو ڈھائی سو کپ چائے کا خرچہ اچھے اچھے شاعروں اور ادیبوں کی کمر توڑ کر رکھ دیتا تھا لیکن میری والدہ جو نہ شاعرہ تھیں اور نہ ہی افسانہ نگار، بس اپنے بچوں کی محبت سے سرشار تھیں۔ اسی لئے جب مجھے اپنی چار تصانیف کا ایک ساتھ رسمِ رونمائی کا خیال آیا تو ہم نے مرحومہ کی یاد میں ایک کُل ہند مشاعرے کا اہتمام بھی کیا۔ کتابوں کی رونمائی اور کُل ہند

مشاعرہ اس قدر کامیاب ہوا کہ ایک ادبی تاریخ رقم ہوگئی۔ یہ تو ایک ابتدا تھی اور میری نظروں میں یہ ایک بڑی خوبصورت ابتدا تھی۔

''نگینہ انٹر نیشنل'' کا پہلا دور ۱۹۶۷ء سے شروع ہوکر ۱۹۷۸ء تک رہا۔ مقامی اور غیر مقامی قلم کاروں کی شمولیت سے ''نگینہ'' ایک اپنی الگ پہچان بنا چکا تھا۔ یہ ریلوے سٹیشنوں پر قائم بک اسٹالوں کے لئے منظور ہو چکا تھا اور اس کی اشاعت حوصلہ افزا تھی۔ ریاست کے کہنہ مشق قلم کار خندہ پیشانی سے اس کے لئے لکھتے تھے اور اس کو پڑھتے تھے۔

عام شماروں کے علاوہ اس کے چند خاص نمبر ادبی دنیا میں اب بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ تخلیق نمبر......فلم سٹار نمبر......لیلیٰ خالد نمبر......غالبؔ نمبر......ادب نمبر وغیرہ۔ ابتدا میں میری کہانیاں روزنامہ ''آفتاب'' کے ادب نامہ میں شائع ہوتی رہیں۔ یہ کہانیاں ''تاش کے باون پتے'' عنوان کے تحت سے شائع ہوتی تھیں۔ ''آفتاب'' کے ادب نامہ میں میری شمولیت ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شمولیت سے میرے قلم کو قوّت ملی۔ ''آفتاب'' کا 'ادب نامہ' ثناء اللہ بٹ مرحوم کی ذاتی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ میں ایس۔ پی۔ کالج کے معروف میگزین ''پرتاپ'' کا مدیر رہا اور کالج میگزین میں میری کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ممبئی سے شائع ہونے والے مقبولِ عام جریدہ ''شاعر'' میں میری کہانی ''جمود کا جنازہ'' جب شائع ہوئی تو مجھے قارئین کے چند خطوط بھی ملے......کچھ تعریفی اور کچھ تنقیدی ان خطوط سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔

ہماری والدہ محترمہ ۵ر جنوری ۱۹۹۳ء کو انتقال کر گئیں۔ اُن کی وفات تر نبو گھرانے کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ثابت ہوا اور ۷ر فروری ۲۰۰۷ء میں ہمارے والد محترم بھی مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ چونکہ میں گھر میں بڑا تھا اس لئے میری گھریلو

ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔اس دوران مجید صاحب لندن میں اپنی قانونی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک الگ مقام بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔اُدھر ۲۰۰۷ء میں مظفر ایرج سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سری نگر لوٹ آئے اور ہماری پرانی دوستی کی راہیں ہموار ہونے لگیں۔''شہنشاہ ہوٹل'' کے خواب آلودہ ماحول میں انہوں نے میرے اندر کے افسانہ نگار کو خوابوں کی دنیا سے جگانے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہوتے بھی نظر آرہے تھے لیکن پھر ایک عجیب سا واقعہ رونما ہوا۔ہوٹل شہنشاہ کے ''دربار ادب'' میں کشمیری شعری مجموعے کی رسم رونمائی انجام دی جارہی تھی۔صاحبِ کتاب میرے جانے پہچانے تھے، میں بھی کچھ دیر کے لئے اس ادبی نشست میں بیٹھا رہا اور جب میں وہاں سے جانے لگا تو معروف افسانہ نگار نور شاہ نے مجھے ایک کتاب پڑھنے کے لئے دی۔اُن کی یہ کتاب ''جموں وکشمیر کے افسانہ نگار'' کچھ ہی عرصہ پہلے منظر عام پر آچکی تھی،اس میں میرا بھی تذکرہ تھا۔میری تحریروں کی تعریف بھی کی تھی، لیکن انہوں نے اپنے انداز سے یہ بھی لکھا تھا'' کہ وحشی سعید نے اب ادبی دنیا کو خیر آباد کر کے دولت کی دنیا کو اپنا لیا ہے لیکن اردو افسانہ کو اب بھی ان کی واپسی کا انتظار ہے''۔یہ تحریر ایک چیلنج کی حیثیت سے میرے سامنے کھڑی ہوگئی اور اب میرے اندر کا افسانہ نگار مکمل طور پر جاگ چکا تھا۔میں نے کاغذ اور قلم سنبھالا اور اپنے افسانوں کی دنیا کو پھر سے آباد کرنے لگا۔میری کہانیوں میں علامتی انداز ایک نئی راہ اختیار کر چکا تھا۔ادبی دنیا سے میری طویل غیر حاضری کے دوران میرے تجربات میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔اس طویل غیر حاضری کی بہت ساری یادیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں اور آہستہ آہستہ میری سوچوں میں اُبھر رہی تھیں اور ''نگینہ'' کے تعلق سے بھی ایک نئی سوچ نے میرے ذہن کے دروازے پر دستک دی۔میں نے ایک ٹیم تشکیل دی اس ٹیم میں میرے اور ظہور صاحب کے علاوہ مظفر ایرج، ڈاکٹر اشرف آثاری اور نور شاہ کو

شامل کیا۔کئی نشستوں میں ’’نگینہ‘‘ کی اشاعتِ نو کے تعلق سے گفتگو ہوتی رہی اور اہم فیصلہ جات لیتے رہے اور پھر ’’نگینہ‘‘ ایک نئی آب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر آنے لگا۔میں بحیثیت ایڈیٹر اور ظہور ترنبو بحیثیت مینجنگ ایڈیٹر سامنے آ گئے۔نور شاہ، مظفر ایرج اور ڈاکٹر اشرف آثاری ادارتی مجلس کے اراکین کی حیثیت میں ’’نگینہ‘‘ کے صفحہ اوّل پر نظر آنے لگے اور مجھے خوشی ہے کہ دوسرے دور میں ’’نگینہ‘‘ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا آرہا ہے۔’’نگینہ‘‘ کے بارے میں زیادہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری اور میرے رفقا کی کارکردگی ’’نگینہ‘‘ کے پڑھنے والوں کے سامنے ہے۔اس نئے دور میں عام شماروں کے علاوہ ’’نگینہ‘‘ کے ادب نمبر، افسانہ نمبر، تخلیق نمبر وغیرہ شائع ہوتے رہے۔ ۲۰۱۸ء میں ’’نگینہ‘‘ نے اپنے پچاس سالہ ادبی سفر مکمل کیا اور اس تعلق سے ’’نگینہ‘‘ کا گولڈن جوبلی نمبر منظرِ عام پر آ گیا۔’’نگینہ‘‘ کا سفر جاری ہے اور ان شا اللہ جاری رہے گا۔’’نگینہ‘‘ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ شہنشاہ پیلس کے ’’دربارِ ادب‘‘ میں مختلف ادبی اور علمی مجلسوں کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔نئی نئی کتابوں کی رسمِ رونمائی ہوتی ہے۔مشاعروں اور علمی وادبی محفلوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ویسے بھی ’’نگینہ‘‘ کے ہر شمارہ کے منظرِ عام پر آنے کے وقت ایک پُر وقار محفل کا اہتمام ہوتا ہے جن میں کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے اَن گنت قلم کار شرکت کرتے ہیں ۔’’نگینہ‘‘ کے نام پر قلم کاروں کو انعامات اور اعزازات سے نوازا جاتا ہے ۔ادھر میرے تخلیقی سفر میں رائٹرس گلڈ کی تشکیل بڑی اہمیت کی حامل ہے میں اس کا سرپرست ہوں۔جموں وکشمیر اور لداخ کے فکشن نگار اس تنظیم سے جڑے ہوئے ہیں، یہ سرکاری سطح پر تسلیم شدہ تنظیم ہے۔اس کا ایک باقاعدہ دفتر ہے جہاں پر ہر ہفتہ فکشن کے تعلق سے محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ فکشن کے فروغ کے تعلق سے اس تنظیم کی بہت ساری ذمہ داریاں ہیں اور یہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے بھرپور کوشش کررہی ہے۔خوش قسمتی سے اس

تنظیم کو فکشن نگاروں کا تعاون حاصل ہے۔میری شائع شدہ کتابوں کی تفصیل یہ ہے:۔

افسانوی مجموعے

☆......سڑک جاری ہے

☆......کنوارے الفاظ کا جزیرہ

☆......خواب حقیقت

☆......ماضی اور حال (۳ جلدیں)

☆......آسمان میری مٹھی میں

☆......ارسطو کی واپسی

☆......آخر کب تک

ناول/ ناولٹ

☆......پتھر پتھر آئینہ

☆......ایک موسم کا خط

☆......قحط

☆......خوف اور محبت

☆......عجب زندگی،غضب موت

☆......جائز ناجائز

☆......فطرت،محبت،ندامت

☆......وحشتِ محبت

ان کتابوں کی تفصیل میرے تعلق سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

☆......''لمحے لمحے''..........مدیر:-حسیب سوز

☆......وحشی سعید ایک منفرد فکشن نگار......ڈاکٹر سیفی سرونجی

☆......وحشی سعید اپنی وحشتوں کے آئینے میں......جاوید انور

میرے ادبی سفر کے دوران مختلف جرائد میں میرے تعلق سے جو گوشے شائع ہوئے ہیں اُن کا ذکر بھی میرے لئے لازمی بنتا ہے۔کیوں کہ یہ گوشے میرے ادبی سفر کی داستان کو سمیٹنے میں بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔

☆-شاعر ☆-بیسویں صدی ☆-عالمی انتساب ☆-تحریرِ نو ☆-تحریک ادب

☆-مفاہیم ☆-لمحے لمحے ☆-تحریک ادب ☆-تریاق

ان رسائل کے علاوہ ''نگینہ انٹرنیشنل'' میں میرے ادبی اور علمی سفر کے تعلق سے مختلف قلم کاروں کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں اور یہ میرے ادبی اور علمی شعور کو

سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ مقامی اخباروں میں خاص طور سے کشمیر عظمیٰ، اُڑان، اور تعمیلِ ارشاد میں بھی میری کہانیاں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ادھر ابھی تک میرے فن پر تین طالب علم ایم۔فل/ پی۔ایچ۔ڈی مکمل کر چکے ہیں اور موضوعات یوں ہیں۔

☆......وحشی سعید کی افسانہ نگاری...... رومینہ تبسم (ایم۔فل) سڑک جاری ہے کے حوالے سے

☆......وحشی سعید کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ......اولیس احمد (ایم۔فل)

☆......وحشی سعید ایک مطالعہ...............ڈاکٹر کائنات شیخ (پی۔ایچ۔ڈی)

ایک اور طالب علم رتیش کمار جموں یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی مکمل کر رہا ہے۔

ادھر میری اردو کہانیوں کے تراجم منصۂ شہود پر آ رہے ہیں۔ان کی تفصیل یوں ہے۔

☆......اردو سے انگریزی ترجمہ نگار:......مشتاق برقؔ

☆......اردو سے کشمیری ترجمہ نگار:......رشید کانسپوری

میری منتخب اردو کہانیوں کا ترجمہ ہندی میں ہو چکا ہے اور یہ کتاب منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ابھی میرا تخلیقی سفر جاری ہے۔اب میں اپنے استاد محترم مرحوم حامدؔی کاشمیری کے ان کلمات کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وحشی سعید کے افسانے زبان و بیان کے تخلیقی سرچشموں کو جگانے اور حیرت ونشاط سے ہم کنار کرنے کی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں۔''

●●●

(وحشی سعید صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ اردو، جلد 58، نمبر 3-1 سے ماخوذ ہے، جو 2020 میں شائع ہوا ہے۔ادارہ)

☆......رفیق راز

ہمارے شعر میں آباد ہے جہانِ طلسم

ہر انٹرویو میں کسی شاعر سے یہ دوسوال ضرور پوچھے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کب پیدا ہوئے، اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ دوسرا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی پہلی تخلیق کون سی ہے؟ دوسرے سوال کا جواب میں نہیں دے پاؤں گا۔ البتہ پہلے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ اس سوال کا تعلق میرے ماضی سے ہے اور ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے ماضی کو پیٹھ پہ لادے ہوئے ہوتا ہے۔ ماضی کی الماری کو کھول کر اس میں سے کوئی بھی چیز نکالی جاسکتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب بھی اس الماری میں موجود ہے۔

میں 10 مارچ 1950 کو دوپہر کے وقت اس جہان فانی میں آیا۔ اس وقت میری ماں کے مطابق باہر برف باری ہورہی تھی۔ اس سال مارچ کے مہینے میں کڑاکے کی سردی پڑی تھی۔ میں جس علاقے میں پیدا ہوا وہ جہلم کے دائیں کنارے پر آباد براری پورہ یا خانقاہ سوختہ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ یہ علاقہ عیدگاہ کے قریب ہے۔ وہ مکان جس میں میرا جنم ہوا، اب بھی وہاں ایک گلی میں موجود ہے۔ اس میں آج کون لوگ آباد ہیں، یہ مجھے معلوم نہیں۔ اس مکان میں نے زندگی کے پہلے دو سال گزارے یا یوں کہیے کہ اس مکان میں زندگی کے پہلے دوسال ماں کی گود میں گزارے۔ اس کے بعد میرے والد صاحب جن کا نام علی محمد شیمر اک تھا, نے وہ مکان بیچ کر سرینگر کے وسط میں دوسرا مکان خریدا جو اس مکان سے زیادہ کشادہ تھا اور

اس کے ساتھ کافی زمین بھی ملحق تھی۔ میرے والد صاحب نے اس زمین کے ایک حصے پر دوسرا مکان تعمیر کرایا۔ یہ علاقہ زینہ کدل کے پاس جہلم کے بائیں کنارے محلّہ چمر دوری کہلاتا ہے۔

میرے والد صاحب کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں سینئر منیجر تھے اور وہ میری پیدائش کے وقت بمبئی کے برانچ میں تعینات تھے۔ میرے والدین کی دس اولادیں ہیں میرا نمبر چھیواں ہے۔ سب سے پہلے لڑکا پیدا ہوا تھا اس کے بعد لگاتار چار بیٹیاں پیدا ہوئیں اور میں ان بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا۔ میرے بعد دو بیٹیاں اور دو بیٹے اور پیدا ہوئے۔ چونکہ میں چار بیٹوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے میرے حصے میں لاڈ پیار زیادہ آیا، ماں بہنیں مجھے حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتی تھیں۔ میں چار سال کا ہونے سے پہلے ہی ٹینڈیل بسکو میموریل سکول میں داخل کرنے کے لئے تیار کیا جارہا تھا۔ پانچ سال کا ہوا تو مجھے اسی اسکول میں داخل کیا گیا۔ یہ انگلش میڈیم اسکول تھا۔ یہاں سے میں نے مڈل پاس کیا۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے مجھے مشن اسکول، جو میرے گھر سے زیادہ دور نہ تھا داخلہ ملا۔ میں اسکول پیدل ہی جاتا تھا۔ بسکو اسکول میرے گھر سے تقریبا چار کلومیٹر دور تھا وہاں میں یا تو تانگے پر جاتا یا بس میں۔ سرینگر میں ساٹھ کی دہائی میں زیادہ تر تانگے ہوا کرتے تھے اور بسیں کم۔

اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف کہ میری پہلی تخلیق کون سی ہے۔ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کیونکہ مجھے خود پتہ نہیں کہ میری پہلی تخلیق کون سی تھی۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نویں جماعت میں مجھے محسوس ہوا کہ میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور جو چیزیں صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہوں وہ کچھ کچھ شاعری جیسی لگتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی چیز کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دن میں نے اپنی لکھی ہوئی چیز اپنے ٹیوٹر کو دکھا دی جو روز شام کو مجھے پڑھانے گھر آتے تھے۔ انہوں

نے میری یہ تک بندی پڑھی اس کے بعد مجھے اتنا ڈانٹا کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔انہوں نے کہا کہ آگے میٹرک کا امتحان ہے اور تمہیں اچھے نمبروں سے پاس ہونا ہے ورنہ کالج میں ایڈمشن نہیں ملے گا۔اگر تم اس خرافات میں قیمتی وقت ضائع کرو گے تو ہو چکے پاس میٹرک میں۔وہ ابھی جوان ہی تھے اور تیز مزاج بھی تھے۔کبھی کبھی مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاتے تھے۔اس کے چند مہینے بعد انہوں نے میرے والد سے کہا کہ اب مجھے سرکاری نوکری مل گئی ہے اور پوسٹنگ دور دراز علاقے میں ہوئی ہے اس لئے میں کل سے پڑھانے نہیں آپاؤں گا۔اس کے بعد دوسرا ٹیوٹر رکھا گیا وہ طبیعتاً نرم خو تھے اور وہ شاید اس وقت ماسٹرس کر رہے تھے۔وہ دونوں اس وقت بقید حیات ہیں اور میری اتنی عزت کرتے ہیں جیسے میں ہی ان کا ٹیوٹر رہ چکا ہوں۔خیر وہ بہت ذہین ہیں۔میں نے ان سے جتنا سیکھا شاید ہی کسی اور سے سیکھا ہو۔انہی میں سے ایک نے مجھ سے کہا تھا کہ تاریخ یعنی ہسٹری اصل میں بادشاہوں کی کہانی ہے، عوام کی نہیں۔انہی میں سے ایک نے نویں جماعت میں کہا تھا کہ وقت ناقابل تقسیم ہے۔ہم اسے سہولت کے لئے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کرتے ہیں۔ورنہ وقت تو ایک دریا کی مانند ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔اس وقت تو میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئی تھیں مگر بعد میں ان جملوں نے مجھ پر کئی دروازے وا کئے جن میں داخل ہو کر میں نئے اور نادیدہ جہانوں میں پہنچ گیا۔اللہ دونوں کی عمر دراز کرے۔بات ہو رہی تھی میری پہلی تخلیق کی۔

میں نے اپنے ٹیوٹروں سے چُھپ چھپا کے یہ تک بندی جسے آپ مشق سخن بھی کہہ سکتے ہیں، جاری رکھی۔میٹرک پاس کرنے کے بعد میں سری پرتاپ کالج میں گریجویشن کے لئے داخل ہوا۔میٹرک کے بعد گریجویشن مکمل کرنے میں ان دنوں چار سال لگتے تھے۔میں پی۔یو۔سی یعنی گیارہویں کلاس میں تھا کہ ایک سینئر لڑکے کو

دیکھا جو ہر ایک سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ جو ''بزمِ ادب'' میں شرکت کا خواہاں ہو وہ اپنا نام لکھوائے۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ ''بزمِ ادب'' میں کیا کرنا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ اگر کوئی لڑکا شاعری یا افسانے وغیرہ لکھتا ہے تو وہ اپنی کوئی چیز وہاں پڑھ سکتا ہے۔ میں نے اپنا نام اور رول نمبر لکھوایا۔ ''بزم ادب'' کی نشست ہر سنیچر کو کلاسز کے بعد منعقد ہوا کرتی تھی۔ سنیچر ایک دو دن میں آنے والا تھا۔ میں نے تیاری شروع کی۔ گھر جاکے اپنی لکھی ہوئی چیزوں میں سے ایک غزل کا انتخاب کیا۔ سنیچر آیا اور وہ گھڑی بھی آئی جب میرے تخلیقی سفر کا حقیقی آغاز ہوا ، اتنا ہی نہیں میرے سفر کی سمت بھی متعین ہوئی۔ میں ڈرتے ڈرتے سہما ہوا لائبریری کی بلڈنگ میں داخل ہوا اور اس ہال نما کمرے میں پہنچا جہاں یہ ادبی نشست منعقد ہونی تھی۔ کمرے میں سننے والے لڑکوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ پڑھنے والے تقریبا بیس بائیس تھے اور پروفیسر صاحبان کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ جن میں پروفیسر غلام نبی فراقؔ، پروفیسر محی الدین حاجنی اور پروفیسر ستار شاہد قابلِ ذکر ہیں اور بھی پروفیسر صاحبان بیٹھے ہوئے تھے جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ میرا نام سولہویں نمبر پر تھا۔ کسی نے کشمیری افسانہ پڑھا کسی نے اردو۔ شاعری بھی کشمیری اور اردو میں پڑھی گئی۔ ایک دو لڑکوں نے انگریزی شاعری سنائی۔ میرا نمبر قریب آتا جارہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ آخر اسی لڑکے نے میرا نام کلاس رول نمبر کے ساتھ پکارا۔ میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ سب لوگ مجھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے میرا جائزہ لے رہے ہوں۔ مجھے سوائے پروفیسر غلام نبی فراقؔ کے کوئی پہچانتا نہ تھا۔ پروفیسر غلام نبی فراقؔ کشمیری زبان کے سر برآوردہ شاعر تھے۔ وہ ہمیں کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے، انہیں میرا نام تک یاد تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا گھبراؤ نہیں آرام سے پڑھو۔ میں نے اردو غزل سنائی، غزل کیا تک بندی

تھی اور شاید بے وزن بھی رہی ہوگی۔ میں غزل سنا چکا تو ایک پاٹ دار آواز گونجی۔ آواز پروفیسر محی الدین حاجنی مرحوم کی تھی جو کالج میں عربی پڑھاتے تھے اور کشمیری زبان میں کئی تحقیقی مقالے لکھ چکے تھے۔اس کے علاوہ کشمیری زبان وادب پر انگریزی میں بھی کئی اہم مقالے لکھ چکے تھے۔عربی، فارسی، انگریزی اور اردو پر ان کو زبردست دسترس حاصل تھی۔ یہ جانکاری مجھے بعد میں ملی۔اس وقت میں ان کے نام اور کام سے بالکل واقف نہ تھا۔تم کہاں کے ہو؟ حاجنی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔سر میں سرینگر کا ہوں۔ میں نے جواب دیا، جب کشمیر کے ہو تو اپنی زبان (کشمیری) میں کیوں نہیں لکھتے ہو۔اگلے سنیچر کو کشمیری تخلیق لے کر آنا۔ میں نے جو اردو غزل سنائی تھی اس پر مجھے کسی سے داد نہیں ملی۔ پروفیسر غلام نبی فراقؔ مرحوم سے بھی نہیں جو میرے انگریزی کے استاد تھے۔نشست ختم ہوئی۔ میں نے تب تک کسی کشمیری شاعر کا کلام نہیں پڑھا تھا۔گھر جا کر میں کشمیری میں غزل لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔غزل تو دور ایک مصرع نہیں ہو رہا تھا۔میں نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ ایک دو کشمیری شعری مجموعے حاصل کئے، ان کا مطالعہ کیا۔ان مجموعوں میں جو شاعری تھی مجھے متاثر نہ کر سکی۔البتہ یہ آئیڈیا ضرور ملا کہ کشمیری میں کیسے لکھا جاتا ہے۔کس طرح کے الفاظ وغیرہ برتے جاتے ہیں۔ دو چار دن تک مسلسل کوشش کر کے بالآخر میں ایک کشمیری غزل لکھنے میں کامیاب ہوا، وہ بھی کسی اور کی زمین میں۔ابھی سنیچر دو تین دن دور تھا، وہ دو تین دن بھی میں نے اس غزل کو مانجھنے میں صرف کئے۔سنیچر آیا میں نے غزل پڑھی اور اتنی داد حاصل کی کہ میرا حوصلہ آسمان کو چھونے لگا۔اس غزل کا مزاج وہ نہیں تھا جو اس شاعری کا تھا جو ان دو کشمیری مجموعوں میں شامل تھی جن سے میں نے استفادہ کیا تھا بلکہ میری اس کشمیری غزل میں قدرتی طور نئی اردو غزل کا رنگ در آیا تھا کیونکہ اس وقت کی اردو شاعری کچھ کچھ میری نظر سے گزرتی رہتی تھی اور اس وقت تک ''شب خوں'' کے بھی ایک

دو پرچے میرے مطالعے میں آچکے تھے۔اس میں جو چیزیں چھپتی تھیں وہ سب کی سب میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں البتہ اس میں چھپنے والی غزلوں کو پڑھ کر ایک عجیب سی تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا تھا۔ یہاں سے میرے کشمیری میں لکھنے کا سفر شروع ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔لیکن اردو میں لکھنا میں نے ترک نہیں کیا۔ میں دونوں زبانوں میں لکھتا رہا۔کشمیر میں منعقد ہونے والی ہر شعری نشست یا مشاعرے میں صرف کشمیری تخلیقات پیش کرتا تھااور اردو کلام بعد میں رسائل میں چھپنے کی غرض سے بھیجتا تھا۔

گیارہویں جماعت سے گریجویشن تک یعنی چار سال میں میرے قلم سے کچھ ایسی غزلیں ٹپکیں جن کا کشمیری ادبی حلقوں میں نوٹس لیا گیا۔سب سے پہلے کشمیر کے سربرآوردہ شاعر،محقق اور نقاد جناب امین کاملؔ نے یہ اعتراف بابانگ دہل کیا کہ رفیق رازؔ کشمیری غزل کوایک نئی سرحد سے آشنا کرار ہا ہے۔امین کاملؔ مرحوم ہر محفل اور سمینار میں میرا اور میری کشمیری غزل کا حوالہ ضرور دیتے تھے۔انہوں نے جتنی میری حوصلہ افزائی کی اور کسی نے اتنی نہیں کی۔وہ خود بہت بڑے شاعر تھے ان کی حوصلہ افزائی معنی رکھتی تھی۔گریجویشن مکمل کرنے تک میں نے کشمیری شعری ادب میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔اس دوران اردو میں میری مشق سخن جاری رہی۔اب میں ’’شب خوں‘‘ کے ہر پرچے کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا تھا۔آپ کو حیرت ہوگی کہ ’’شب خوں‘‘ کے بند ہونے تک میں کسی اور اردو رسالے کو نہیں پڑھتا تھا۔البتہ انگریزی ادب کا مطالعہ جاری تھا۔اس دوران ابنِ صفی کے بیسیوں ناول میرے مطالعے میں آئے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان ناولوں سے میری اردو کچھ اور بہتر ہوگئی۔

خیر گریجویشن مکمل کرنے کے بعد میں کشمیر یونیورسٹی میں ماسٹرس کے لئے داخل ہوا، یہاں کی فضا کالج کی فضا سے وسیع تھی۔ یہاں مجھے اردو کی بڑی شخصیتوں کو

دیکھنے اوران سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے پہلی باریہیں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، آل احمد سرور، جناب عالم خوند میری اور دیگر مشاہیر کو دیکھا اور سنا۔ کالج کے اساتذہ میں پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر قاضی غلام محمد صاحبان قابل ذکر ہیں جنہوں نے مجھے اردو میں لکھتے رہنے کی ترغیب دی۔ یہاں مشاعرے بھی کرائے جاتے تھے جن میں مجھے اپنی اردو غزلوں کو پیش کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دفعہ سردار جعفری کسی سلسلے میں کشمیر آئے ہوئے تھے تو پروفیسر شکیل الرحمٰن نے کلاس روم ہی میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت علی سردار جعفری نے کی۔ اس نشست میں صرف چند پروفیسر صاحبان اور چند ابھرتے ہوئے ہونہار طلبا کو کلام پڑھنا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ طلبا کی فہرست میں میرا نام پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب (صدرِ شعبۂ اردو) نے سب سے پہلے لکھا کیونکہ وہ بھی میرے بارے میں حسنِ ظن رکھتے تھے، اور انہوں نے میری کشمیری شاعری کے چرچے بھی سن رکھے تھے۔ جب میں نے کلام پڑھا تو پہلے دو تین اشعار پر علی سردار جعفری خاموش رہے۔ ظاہر ہے میری غزل ایسی تھی جسے عرف عام میں شب خونی غزل کہہ سکتے ہیں۔ میں نے سوچا شاید اسی وجہ سے علی سردار جعفری صاحب جو کہ (ترقی پسندوں کے سردار بھی تھے) میری غزل کو پسند نہیں فرمارہے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے میری یہ غلط فہمی دور ہوئی جب میں نے غزل کا چوتھا شعر پڑھا، شعر آج بھی مجھے یاد ہے۔ ؎

تمہارے جسم کا موسم تو خوشگوار لگا　　　ہماری روح کی آب و ہوا نہیں پوچھو

یہ شعر سن کر علی سردار جعفری صاحب نے خوب داد دی اور مشاعرے کے بعد کئی دن تک مجھ پر اس کامیابی کی سرشاری طاری رہی۔ 1974ء میں شمس الرحمٰن فاروقی کو میں نے کشمیر یونیورسٹی میں پہلی بار دیکھا جب میں ایم۔اے کے پہلے سال میں تھا۔ فاروقی صاحب کا لیکچر شعبۂ اردو میں تھا، جسے سننے کے لئے ادب سے دلچسپی

رکھنے والے مختلف شعبوں سے وابستہ پروفیسر صاحبان اور طالب علم آئے تھے۔شب خوں 1972ء سے مسلسل میرے مطالعے میں تھا اور اس نے میرے دل و دماغ کو مکمل طور اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔فاروقی صاحب کے کئی مضامین بھی پڑھ چکا تھا۔مرحوم پروفیسر شکیل الرحمٰن صدرِ شعبہ اردو نے ان کا تعارف کرایا لیکن میرے لئے یہ تعارف رسمی سا تھا کیونکہ ''شب خوں'' کے مطالعے سے میں اس دماغ سے پہلے ہی متعارف ہو چکا تھا جو ''شب خوں'' کے پیچھے کارفرما تھا۔لیکچر کو میں نے انہماک سے سنا۔لیکچر کے بعد فاروقی صاحب سے کچھ سوالات پوچھے گئے جن کے تسلی بخش جواب دیئے گئے۔اس طرح یہ مجلس برخواست ہوئی۔سب نے ان سے ہاتھ ملایا میں نے بھی مصافحہ کیا اور اندر سے بہت خوش ہوا کہ میں نے نہ صرف اس شخصیت کو روبرو دیکھا بلکہ اس سے ہاتھ بھی ملایا جس نے ایک پورے عہد کے ادبی مزاج کو تبدیل کیا ہے۔

دوسرے دن جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی نے سرینگر کے لالہ رخ ہوٹل میں ان کے اعزاز میں ایک عشائیے کا انتظام کیا تھا جس میں سرینگر کے قابل ذکر کشمیری اور اردو ادیبوں کو مدعو کیا گیا تھا۔میں بھی وہاں موجود تھا۔مجھے فاروقی صاحب کو دیکھنے اور انہیں سننے کا شوق کھینچ لایا تھا۔کوئی اور ہوتے تو شاید میں نہ آپاتا کیونکہ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔اسی لئے پروگرام افطار کے بعد رکھا گیا تھا۔اس پروگرام سے پہلے دن کو مرحوم ظفر احمد جو سرینگر دور درشن کے پروڈیوسر تھے، نے دور درشن میں ایک شعری نشست رکھی تھی۔اس شعری نشست میں فاروقی سمیت صرف چھ شعرا کو مدعو کیا گیا تھا ۔میری خوش نصیبی کہ ظفر احمد نے مجھے بھی اس شعری نشست کے لئے بک کیا تھا۔میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔خوشی کے مارے اس دن جو میری حالت تھی، وہ دیدنی تھی۔میں وقت مقررہ سے پہلے ہی دور درشن پہنچا۔ریکارڈنگ میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔میں باہر لان میں تھا کہ میری نظر ایک محترمہ پر پڑی ان محترمہ کے ساتھ

دو چھوٹی چھوٹی اور دبلی پتلی سی لڑکیاں بھی تھیں۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ فاروقی صاحب کی اہلیہ مرحومہ جمیلہ فاروقی ہیں اور وہ دو چھوٹی لڑکیاں ان کی صاحب زادیاں باراں اور افشاں ہیں۔

جب شعری نشست کی ریکارڈنگ شروع ہوئی میری حالت غیر تھی۔ میں خوف زدہ تھا کہ میری تگ بندی سن کر پتہ نہیں فاروقی صاحب کیا رائے قائم کریں گے۔میرے حوصلے بہت بلند تھے۔ میں فاروقی صاحب کو (Impress) کرکے ''شب خوں'' میں چھپنا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے سارے منصوبوں پر پانی نہ پھر جائے۔اس سے پہلے ''شب خون'' میں چھپنے کی میری کوشش ناکام ہو چکی تھی کہ مرحوم سید ارشاد حیدر صاحب میری تخلیقات معذرت کے ساتھ دو بار واپس کر چکے تھے۔اب میں اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔شعری نشست میں سب سے پہلے مجھ سے پڑھوایا گیا۔میں چوبیس سال کا لڑکا اور سامنے فاروقی صاحب جیسا نابغہء روزگار ،میری حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔میرے ایک آدھ شعر پر فاروقی صاحب نے سر ہلا کے پسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا۔میں بہت خوش ہوا اور مرحوم ظفر احمد کو اندر ہی اندر دعائیں دیتا ہوا وہاں سے نکلا جنہوں نے مجھے اس شعری نشست میں شریک کیا تھا۔یہ وہی ظفر احمد ہیں جن کا انتقال نوے کی دہائی میں رانچی میں ہوا۔اس وقت وہ رانچی دوردرشن کے ڈائریکٹر تھے اور نظموں کے بہت عمدہ شاعر تھے۔اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔اس مشاعرے کے بعد فاروقی صاحب نے مجھ سے کہا ہمیں اپنا کلام کیوں نہیں بھیجتے ، میں نے فوراً کہا جناب بھیجا تھا لیکن وہاں سے سید ارشاد حیدر صاحب کے دوسطری جواب کے ساتھ کلام واپس بھیج دیا جاتا ہے۔۔انہوں نے مجھے اپنے گھر کا پتہ لکھوایا اور ہدایت کی کہ اس پتہ پر اپنا کلام بھیجو۔یہ 1974 ستمبر کا مہینہ تھا۔میں نے دوسرے ہی دن اپنی دو تین غزلیں اور دو تین نظمیں روانہ کیں۔74 بھی نکلا

75 بھی نکلا میرا کلام نہیں چھپا۔ان دنوں سال میں مشکل سے ’’شب خون‘‘ کے تین یا چار شمارے نکلتے تھے۔76 کا ستمبر کا مہینہ آیا۔’’شب خون‘‘ کا سواں شمارہ نمبر ۱۰۰ آیا۔اس میں میری ایک غزل اور ایک نظم شامل تھی۔میرے پاؤں مشکل سے زمین پر پڑتے تھے۔اس کے بعد میں لگاتار’’شب خون‘‘ میں چھپتا رہا اور غالباً ظفر اقبال کے بعد میں دوسرا شاعر ہوں جس کی زیادہ غزلیں چھپی ہیں۔سن 76 سے اس کے بند ہونے تک میری تقریباً 129 غزلیں اس میں شائع ہوئی ہیں۔اس سے زیادہ سوائے ظفر اقبال کے کسی کی تخلیقات شائع نہیں ہوئی ہیں۔

’’شب خوں‘‘ میں پہلی بار اپنی ایک غزل اور ایک نظم دیکھ کر میں اردو کی طرف زیادہ توجہ دینے لگا۔اب میں چاہتا تھا کہ میری اردو تخلیق خوب سے خوب تر ہو۔میں اب وقفے وقفے سے ’’شب خون‘‘ میں چھپنے لگا اور میرا حوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ایم اے کرنے کے بعد میں ابھی مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری ریسرچ سینٹر کو ترقی دے کر باقاعدہ ایک شعبہ بنایا گیا۔جہاں ڈپلوما اور ایم۔اے بھی کیا جاسکتا تھا۔پروفیسر رحمٰن راہی صاحب، جو اس وقت شعبۂ فارسی میں بحیثیت ریڈر تعینات تھے، کو شعبۂ کشمیری کا صدر بنا دیا گیا۔ایک لیکچرر کی تعیناتی کی گئی اور وہ تھے ڈاکٹر شفیع شوق۔ظاہر ہے کہ دو آدمی پورا شعبہ نہیں چلا سکتے تھے اور آدمیوں کی ضرورت تھی۔ایک دن پروفیسر رحمٰن راہؔی صاحب پوچھتے پوچھتے میرے گھر پہنچ گئے اور مجھ سے کہا کہ آپ شعبۂ کشمیری میں فی الحال ایڈہاک لیکچرر کی حیثیت سے کام کیجئے۔

اس کے بعد جونہی اور اسامیوں کی جگہ نکل آئے گی، آپ کو مستقل کیا جائے گا۔اس وقت میں پروفیسر حامدؔی کے تحت اردو شاعری میں علامت نگاری کے عنوان پر ایم فِل کر رہا تھا۔میں نے راہؔی صاحب سے کہہ دیا کہ میں آنے والے سوموار سے

آؤں گا۔اس طرح سے میرے کیریئر کا آغاز یونیورسٹی کے ایک ایڈہاک لیکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ایک سال کے بعد ایک لیکچرر کی اسامی کے لئے انٹرویوز ہونے جارہے تھے۔میں نے بھی اپلائی کیا ہوا تھا اور میں پُر امید تھا کہ میری تقرری ہوجائے گی کیونکہ رحمٰن راہی صاحب انٹرویو میں خود موجود ہوں گے اور ایکسپرٹ بھی ان ہی کی پسند کا مدعو کیا گیا تھا۔میں نے انٹرویو دیا اور تیسرے دن ہی پتہ چلا کہ میری تقرری نہیں ہوئی۔اس کے بعد یو۔پی۔ایس۔سی کا ایک اشتہار میری نظر سے گزرا۔آل انڈیا ریڈیو کو کچھ پروگرام آفیسروں کی ضرورت تھی۔میں نے فوراً اپلائی کیا۔کچھ مہینوں کے بعد دلی میں انٹرویو ہوا۔میرا اسلیکشن ہوا اور میری پوسٹنگ سرینگر کے ریڈیو اسٹیشن میں ہوئی۔میں نے ریڈیو اسٹیشن جوائن کیا۔اس نوکری میں کوئی فراغت نہیں تھی۔کبھی کبھی ٹرانسمشن بند ہونے تک یعنی رات کے گیارہ بجے تک اسٹیشن میں رہنا پڑتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایم۔فل نہ کرسکا۔

ریڈیو میں آنے کے بعد مجھے تخلیقی کاموں کے لئے کم وقت ملنے لگا۔کم گو تو میں پہلے ہی تھا لیکن اب وقت نہ ملنے کے باعث کچھ اور کم گو ہوا۔کبھی کوئی تخلیق کشمیری میں ہوتی تھی تو کبھی اردو میں۔اردو میں لکھی ہوئی تخلیق فوراً ''شب خون'' کو بھیجتا اور وہ ایک طویل وقفے کے بعد چھپتی۔میں اسّی کی دہائی کی بات کررہا ہوں۔ان دنوں ''شب خون'' تین یا چار مہینوں کے بعد آتا تھا اور کبھی کبھی تو چھ مہینوں کے بعد۔ہم اس کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔

اسّی کی دہائی میں میرے لکھنے کی رفتار کچھ کم ہوئی۔کبھی کبھار کوئی غزل ہوتی تھی۔یہاں تک کہ سال 1990 آیا۔اس سال سے کشمیر کی پرآشوب تاریخ کی شروعات ہوئی۔زندگیوں کا معمول تبدیل ہوگیا۔ریڈیو کے معمولات پر بھی اثر پڑا۔مجھے اب لکھنے پڑھنے کے لئے کافی وقت ملنے لگا۔اب میرے لکھنے کی رفتار بھی کچھ تیز

ہوئی اور اسّی نوے کی دہائی میں ''شب خون'' میں متواتر چھپتا رہا۔1995ء میں، میں نے اپنا پہلا کشمیری مجموعہ ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ (نے چھے نالان) اسی سال چھپ کر آ گیا اور یہاں کے ادبی حلقوں میں اسے خوب پذیرائی ملی۔اس مجموعہ کو ریاستی کلچرل اکیڈمی کا ایوارڈ 1996 میں ملا اور 1997 میں اس مجموعے کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل گیا۔2004 میں میرا پہلا اردو مجموعہ (انہار) شائع ہوا اور اس کی بھی اردو کے جدید ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ 2006ء میں میرا دوسرا کشمیری شعری مجموعہ (دستاویز) شایع ہوا۔ یہ کافی ضخیم شعری مجموعہ تھا۔اس کے بعد میرا دوسرا اردو شعری مجموعہ (مشراق) منظر عام پر آیا۔2009 میں میری ایک اور کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب کشمیری عروض سے متعلق تھی۔اس کتاب میں بحور و اوزان کی جانکاری تو تھی ہی لیکن زیادہ زور ان مسائل پر تھا جو کشمیری غزل پر عروض کے اطلاق سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ مسائل تلفظ اور لسانیاتی نوعیت کے ہیں جن پر کتاب میں خوب بحث کی گئی ہے اور ان کا حل بھی تجویز کیا گیا ہے۔اس کتاب میں ان بحور کا بھی تذکرہ ہے جو میری کھوج کے مطابق کشمیری موسیقی سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہایت آسان اور سہل الفاظ میں زحافات، تخفیف، تقطیع اور تسکین اوسط کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

2010 میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔تب تک میں کئی ریڈیو اسٹیشنوں میں مشکل ترین حالات میں کام کرنے کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ یہاں تک کارگل جنگ کے دوران مجھے ریڈیو سٹیشن کارگل کا چارج دیا گیا۔ جہاں میں نے تین سال کام کیا۔خیر میرے ریڈیو میں کام کرنے کی داستان الگ ہے،اسے یہاں بیاں کرنے کا موقع نہیں۔ایک بات کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ جو بھی شاعر اور ادیب ریڈیو میں بحیثیت ملازم داخل ہوا اس کو اپنی تمام تخلیقی قوت ریڈیو کے لئے لکھنے میں ہی صرف کرنا پڑتی ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ ریڈیو کے لئے بھی لکھتا رہا اور جینوئن

ادب تخلیق کرنے کے لئے بھی اپنی تخلیقی قوتوں کو بچائے رکھا۔

شاعری کے بارے میں میرا تصور یا نظریہ کیا ہے اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں یہ بتاؤں گا کہ میں کس طرح کی شاعری پسند کرتا ہوں۔ یہ بتانے سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ مجھے کس طرح کی شاعری پسند نہیں۔ مجھے وہ شاعری بالکل ہی پسند نہیں جس میں صرف قافیہ پیمائی کی گئی ہو۔ ایسی شاعری کو موزوں گوئی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مجھے وہ شاعری بھی پسند نہیں جس میں محض کسی خیال یا کسی جذبے یا کسی احساس کی اسی طرح ترسیل کی گئی ہو جس طرح نثر میں کی جاتی ہے۔ شاعری میں بیانیہ کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہونا چاہئے یا ہونا ہی نہیں چاہیے۔ ایسی شاعری بھی مجھے بالکل پسند نہیں جس میں قاری کی شرکت کی گنجائش ہی موجود نہ ہو، جو شعر پڑھتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے جیسے چٹکلہ سنتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔ مجھے وہ شاعری پسند ہے جس میں خیالات کی ترسیل نہیں بلکہ تجربے کی تجسیم کی گئی ہو۔ ایسی شاعری ظاہر ہے مبہم ہوتی ہے اور قاری کو ایسی شاعری میں شرکت کا بھرپور موقع بھی ملتا ہے۔ وہ اپنی پسند کے معنی شعر سے اخذ کرسکتا ہے یا متن کے پیش نظر شاعر کے معنی ومنشا کو رد کر کے نئے معنی کی تعمیر کرسکتا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب شاعری کثیر المعنویت کی حامل ہو۔ ظاہر ہے ایسی شاعری کے لئے شاعر کو زباں سازی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے یا زباں کو پیچیدہ سے پیچیدہ تجربات کو پیش کرنے کے قابل بنانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے وہ پیکروں، علامتوں اور استعاروں کو بروئے کار لاتا ہے۔ کیوں کہ انہی چیزوں کو برت کر زباں کو تخلیقی بنایا جاسکتا ہے۔ اگر ان چیزوں کو برتنے سے اجتناب کیا جائے تو شاعری کی زبان بھی تخلیقی نہیں رہتی اور غیر تخلیقی زبان میں کی گئی شاعری میرے خیال کے مطابق شاعری کہلانے کی حقدار نہیں۔ یا ایسی شاعری ایک بار پڑھ کر دوبارہ نہیں پڑھی جاتی۔ جبکہ وہ شاعری جو تخلیقی زبان میں کی گئی ہو جس میں ابہام بھی ہو کثیر

المعنویت کی حامل ہوتی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعر چیستان ہو یا معمہ ہو جو سمجھ ہی میں نہ آئے۔ بعض اوقات ایک سیدھا سادا سا نظر آنے والا شعر بھی اتنا مبہم ہوتا ہے کہ قاری ذہنی طور اس شعر میں شریک ہو کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ میرؔ کے کئی اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ بظاہر آسان نظر آتے ہیں لیکن ہوتے نہیں۔غرض ایسی شاعری کو میں پڑھتا ہوں اور پسند کرتا ہوں اور ایسی ہی شاعری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

●●●

(رفیق رازؔ صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ اردو، جلد 61، نمبر 12-11 سے ماخوذ ہے، جو 2023 میں شائع ہوا ہے۔ادارہ)

☆............خالد بشیر احمد

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

میری زندگی میں حیرت انگیز اور پُر افسوس واقعات بدرجہ قلیل تر بھی موجود نہیں ہیں۔ کبھی ایسا کوئی کارنامہ سرزد نہیں ہو سکا جس پر فخر سے سینہ پھولتا۔ ساری زندگی سُست رفتاری سے مگر اپنی شرطوں پر گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی کچھ عجلت میں کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ اپنی مختصر سی دنیا میں مگن ہوں، جس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں مسرت فراہم کرتی ہیں اور ذرا ذرا سے مسائل پریشان کرتے ہیں۔

پیدائش سرینگر شہر کے معروف علاقہ سونہ وار میں ہوئی۔ اس دن کشمیر نے دبیز سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ گھر کے بڑوں کے مطابق غضب کی سردی تھی اور برف گھٹنوں اونچی جمع ہو کر جم گئی تھی۔ پانی کے نلوں کے ساتھ ساتھ سارا ماحول منجمد تھا۔ ایسے میں گھر میں پانی موجود نہیں تھا جو جمی ہوئی برف آگ پر پگھلا کر میسر کیا گیا۔ اسی پانی سے مجھے پہلی بار نہلایا گیا۔

میرے آباواجداد سونہ وار میں ہی آباد کشمیری الاصل تھے، جو میری پیدائش سے کئی نسلیں قبل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ والد صاحب محکمۂ کسٹم میں ملازم تھے۔ چار بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل ہم والدین کی چھ اولادیں تھیں جن میں سب سے بڑی ہمشیرہ اور سب سے چھوٹا میں ہوں۔ سب سے بڑے بھائی محمد شفیع صاحب ڈاکٹر ہیں اور مدینہ منورہ (سعودی عرب) میں ڈیڑھ دہائی تک نوکری کر کے اب فر

اغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔دوسرے برادر غلام محی الدین صاحب کا انتقال فروری ۲۰۰۸ء میں ہوا۔ان کے بعد دوسری ہمشیرہ ہیں۔تیسرے برادر ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ جیالوجی اینڈ جیوفزیکس کے پروفیسر اور سربراہ کی حیثیت سے فروری ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہوئے۔وہ طبقات الارض کے مقتدر سائنسدان ہیں۔

تعلیمی ریکارڈ کے مطابق میری پیدائش 20 فروری 1954ء کو ہوئی ہے۔ان دونوں فروری کے مہینہ میں شدید سردی اور برفباری کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔اگر برفباری شام کو شروع ہوتی تو صبح تک برف کی کئی فٹ اونچی تہہ جمع ہو جاتی اور بازار سے ناشتے کی روٹی لانے کے لئے پہلے برف ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔اس طرح جو تنگ راستہ بن جاتا تھا اس کے دونوں طرف برف کے پہاڑ جمع ہو جاتے جو اکثر سات آٹھ سال کے بچے کے قد سے بلند ہوتے۔ برف کے ساتھ پیدائشی قربت کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مجھے گرتے ہوئے برف کے گولے اور گھٹنوں تک اونچی برف کیوں پسند ہے۔بچپن میں برف سے کھیلنا محبوب مشغلہ تھا۔صاف و شفاف سفید برف کی موٹی تہہ پر چل کر اپنے جوتوں کے نشان چھوڑنا بہت اچھا لگتا تھا۔پاؤں کے نیچے دبنے والی برف کی چرمراتی آواز طربیہ سنگیت سے زیادہ مزہ دیتی۔ایسا ہی مزہ موسم خزاں میں گرے ہوئے چنار کے سرخی مائل پتوں پر چلنے میں آتا۔ہم عمر بچوں کے ساتھ برف کے انسان بنانا بھی بے حد اچھا لگتا تھا گو کہ اس کھیل میں انگلیوں کے پورسُن ہو جاتے۔

جب میری سرکاری ملازمت کی ابتدا ہوئی تو برفباری کے دوران اکثر امیرا کدل میں واقع اپنے دفتر سے دریائے جہلم کے کنارے کنارے پیدل چل کر گھر جاتا اور چھتری کے بغیر گرتی ہوئی برف کا مزہ لیتا۔ایسے ہی ایک موقع پر میں نے اردو

کے نامور شاعر مظہر امام، جو اُن دنوں دور درشن کی ملازمت کے سلسلے میں سرینگر میں مقیم تھے، کو اچانک رک کر اپنے ساتھی سے کہتے سنا کہ "دنیا میں برفباری کا ایسا خوبصورت منظر کہیں نہیں دیکھا ہے۔" آج بھی جب برف گرتی ہے تو میں اس کا مزہ لینے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور اگر گھر سے باہر ہوں تو میرے دوست برف کے ساتھ میری وارفتگی کو دیکھتے ہوئے ٹیلی فون کے ذریعے برفباری کی نوید دیتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ کہ برف کے ساتھ اس وارفتگی کے باوجود میری شاعری میں شاید اس ایک شعر کے سوا برف کہیں بھی موجود نہیں۔

کہہ دے ورنہ لب پر بول اٹک جائیں گے
بھاری برف میں گھر، آنگن سب ڈھک جائیں گے

بچپن کی یادوں میں جو بات اب تک ذہن میں تازہ ہے، وہ بڑی بےفکری کے دن تھے۔ ایسا معاملہ شاید سب کے ساتھ ہوتا ہوگا، لیکن میں آج بھی وہ دن جینا چاہتا ہوں اور کئی بار تصور میں ایک ایسی کیفیت سے گزرتا ہوں جس میں اُن دنوں کے مناظر اور آوازیں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔ سونہ وار میں جہاں ہم رہتے تھے، وہ دریائے جہلم اور شاہراہ کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا محلّہ ہے جس کی انفرادیت اس بات میں تھی کہ وہاں سب گھر ایک ہی بڑے خاندان کی منقسم اور پھیلی ہوئی اکائیاں تھے۔ یوں جو ہمارے ہمسائے تھے، وہی رشتہ دار بھی تھے۔ اس ماحول میں جن بچوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھیلنا، کودنا تھا، وہ سب میرے کزن تھے۔

والد صاحب کا نام محمد احسن بٹ تھا جو ہر اچھے والد کی طرح بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ علاقہ کے اصحابِ عزت وتوقیر میں تھے۔ شرافت اور دیانت ان کا خاصہ تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ وہ جب بھی محلّہ یا بازار سے نکلتے تو لوگ ان کی تعظیم کرتے۔ گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور اس پر چھ اولادوں کو پالنا پوسنا اور تعلیم

دلانا، دو دو بیٹیوں کی شادی کرنا، نیا مکان تعمیر کرنا اور بڑے بیٹے کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا واقعی کارِ دارد والا معاملہ تھا لیکن انہوں نے اپنے جیتے جی یہ ذمہ داری اپنے اسم گرامی کے عین مطابق احسن طریقے سے نبھائی۔ اس کارِ سخت میں انہیں قرض بھی لینا پڑا اور پشتینی زمین بیچنے کا دل شکن فیصلہ بھی کرنا پڑا۔ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں والدین کا چہیتا تھا۔ 7 جولائی 1969ء کو جب میں نے نویں جماعت کا امتحان پاس کر کے دسویں میں داخلہ لیا ہی تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ان کے سنگِ مزار پر اس نسبت سے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر کندہ ہے۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم چوں مرگ آید تبسم برلب اُوست

والد صاحب کے انتقال سے قبل بڑے بھائی صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر کے ڈاکٹر کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہو گئے تھے اور عمر میں ان سے چھوٹے بھائی صاحب غلام محی الدین بھی محکمہ میکینکل اینڈ اسٹورز میں ایک نچلی اسامی پر تعینات تھے۔

والدہ محترمہ ایک باہمت، غیرت مند اور ہٹ کی پکی خاتون تھیں۔ وہ اَن پڑھ تھیں لیکن معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے میں ان کی ذہانت کا جواب نہیں تھا۔ محلے کی اکثر خواتین ان سے کئی معاملات میں مشورہ لیتیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے گھر کو سنبھالا۔ صحت کے معاملے میں وہ دھان پان سی خاتون اور بلڈ پریشر کی دائمی مریضہ تھیں۔ ان کی صحت اکثر خراب رہتی لیکن انہوں نے صحت کی خرابی کو کبھی بھی اپنے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے آخری ایام تک کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور گھر کی صاف صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ میں اپنی والدہ کے بہت قریب رہا اور اس وجہ سے ان کی عنایت اور محبت کو بطور خاص بٹو

رتا رہا۔ بڑے بھائی صاحب نوکری کے سلسلے میں گھر سے باہر ہی رہے اور دوسرے بھائی صاحب علی گڑھ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد دہرہ دون کے انسٹیٹیوٹ آف ہمالین جیالوجی میں بطور سائنسدان تعینات ہوکر وہیں منتقل ہوئے۔ ہمشیرہ کی شادی والد صاحب کی حیات میں ہی ہوئی تھی۔ اس طرح برادر محمد اسمٰعیل بھی دہرہ دون سے منتقل ہوکر کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر اور شعبۂ جیالوجی اینڈ جیوفزیکس کے سربراہ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ میں جب بھی بیمار یا پریشان ہوتا تو والدہ محترمہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ ایسے میں وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتیں جس سے سارے درد اور پریشانیاں دور ہوتیں۔ ایسا ان کی زندگی کے آخری ایام تک رہا۔

دنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں
ان کے دستِ شفقت گویا ایک دعا ہوتے ہیں
جن کے لمس سے سارے درد ہوا ہوتے ہیں
اولادوں کے حق میں سچی ہوتی ہیں
دنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں

عمر کے آخری برسوں میں والدہ محترمہ عارضہ قلب میں مبتلا ہوگئیں جو بالآخر 8 نومبر 2003ء کو اُن کی جان لے بیٹھا۔ آخر چند مہینوں میں جب وہ بسترِ مرگ پر تھیں، میں تقریباً ہر لمحہ ان کے ساتھ رہا۔ ان کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر پا رہا تھا اور اکثر اللہ سے دعا کرتا کہ ہم دونوں کا اختتام بالخیر ایک ساتھ ہوتا کہ ایک کو دوسرے کی جدائی کا غم برداشت نہ کرنا پڑے۔ مگر اللہ کے فیصلوں کے آگے کس کی چلتی ہے؟ والدہ محترمہ کا انتقال میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس سانحہ نے اچانک جیسے مجھے بے سہارا اور تنہا کر دیا۔ اگر چہ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں لیکن شادی نہ کر کے میں نے انہیں بڑی ذہنی تکلیف پہنچائی تھی جس کا ذکر وہ اگر چہ مجھ سے نہیں

کرتیں لیکن ان کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔میرے دوستوں سے البتہ وہ اس دکھ کا اظہار کرتیں۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔آمین۔

گھر کا ماحول سخت نظم وضبط والا تھا۔اگر چہ والد صاحب اپنے شانت سو بھاؤ کی وجہ سے بچوں پر غصہ نہیں کرتے تھے تاہم بڑے بھائی صاحب چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر بھی نہ صرف جھاڑ پلاتے بلکہ مار پیٹ بھی کرتے تھے۔دو واقعات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔بچپن میں ایک دن شام سے پہلے میں محلّہ کے دیگر بچوں کے ساتھ گھر سے لگتی ہوئی شاہراہ کے پار کھلے میدان، جسے لولی باغ کہتے تھے اور جو بعد میں فوج نے اپنی تحویل میں لیا، میں کھیل رہا تھا۔اچانک بادل زور کی گرج کے ساتھ پھٹ گئے۔ہم سب گھبرا گئے۔سارے بچے گھر لوٹے لیکن اس شام جو میری پٹائی ہوئی وہ آج تک حافظے میں محفوظ ہے۔بھائی صاحب نے بڑی فراخ دلی سے ہاتھ چلایا اور بچھو بوٹی سے میری پٹائی کی۔اس شام امرناتھ یاترا کی چھڑی روانہ ہونے والی تھی اور سارا سونہ وار یہ منظر دیکھنے کے لئے شاہراہ پر اُمڈ آیا تھا۔میں بدن پر مٹّی کا لیپ لگا کر گھر کے برآمدے میں درد سہلا رہا تھا۔ایسے ہی نوجوانی کے ایام میں ایک مرتبہ میں گھر کے باہر شاہراہ کے کنارے کھڑا تھا کہ مجھے بھائی صاحب بس سے اترتے ہوئے دکھائی دیئے۔چنانچہ میں جلدی سے بھاگ کر گھر پہنچا۔اس پر بھی زبردست پٹائی ہوئی اور وجہ ان کے اس سوال میں موجود تھی کہ تمھیں کیا لگا میں نے تمھیں سڑک پر نہیں دیکھا تھا؟ایسے ماحول میں آوارہ گردی یا خرمستی، جو عام طور پر بچوں اور نوجوانوں کا معمول ہے، کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ایک لحاظ سے یہ سختی فائدہ مند رہی۔میں کم وبیش کتابی کیڑا بن گیا اور اوّل جماعت سے لے کر ایم۔اے تک میں نے ہر امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا گھر کا ماحول نظم وضبط اور نگرانی والا تھا جہاں حصولِ علم کے علاوہ کسی اور سرگرمی کی گنجائش بہت کم تھی۔ سنیما بینی اور سگریٹ نوشی شجرِ ممنوعہ تھے۔ سگریٹ نوشی نہ صرف یہ کہ میں نے کبھی نہیں کی بلکہ اسے نفرت کی حد تک ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے سگریٹ کے دھوئیں سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ سولہ سال کی عمر تک میں نے سنیما کا دروازہ نہیں دیکھا تھا۔ ہائی اسکول بادامی باغ، بٹہ وارہ میں واقع تھا۔ گھر اور اسکول کے درمیان براڈوے سنیما واقع تھا لیکن اسکول جاتے ہوئے یا واپسی پر میں کبھی بھی سڑک کے اس طرف نہیں چلتا تھا جہاں سنیما موجود تھا اور ارادتاً کبھی اس طرف نہیں دیکھا۔ پہلی فلم میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد دیکھی۔ یہ جیمس بانڈ سیریز کی انگریزی فلم You Only Live Twice تھی جس میں مشہور اداکار شان کانری نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ میرے لئے داخلے کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے بٹہ وارہ کے میرے ایک ہم جماعت بشیر احمد کو پولیس والوں کے ڈنڈے کھانے پڑے جس سے ان کے چہرے سے خون بھی نکل آیا۔ موصوف نے میرے لئے یہ سزا خوشی خوشی سہہ لی۔ معلوم نہیں آج کل وہ کہاں ہیں۔ بہرحال جہاں بھی ہوں اللہ انہیں خوش رکھے کہ میرے لئے انہوں نے اپنا خون بہایا ہے۔ یہاں یہ اعتراف کرنا مناسب ہوگا فلم دیکھ کر میرے پلے کچھ نہیں پڑا جبکہ سنیما ہال میں موجود اکثر ظاہراً ان پڑھ لوگ فلم کے ہر مکالمے کا بھرپور لطف لے رہے تھے۔ اس سے قبل بچپن میں جب بھائی محمد اسمٰعیل صاحب نے فلم ''ماں کے آنسو'' دیکھی تھی تو انہوں نے فلم کی کہانی سنائی جس میں ایک سین اس طرح کا تھا کہ ایک کردار دوسرے کردار سے اپنا پیسہ وصول کرنے کے لئے ایک سال بعد اس کے پاس جاتا ہے۔ ایک لمبے عرصہ تک میں اس شش و پنج میں تھا کہ بھائی صاحب تو تین گھنٹوں میں ہی فلم دیکھ کر واپس آ گئے تو اس دوران ایک سال کیسے گزر گیا۔ میرے کزن نیاز

احمد خوب فلمیں دیکھتے تھے اور ہر نئی فلم دیکھ کر اس کی کہانی اور مکالمے ایک ہفتے تک چٹخارے لے لے کے سناتے تا ایں کہ دوسری فلم دیکھ کر نہ آتے جس کے بعد سلسلہ پھر شروع ہوتا۔ میرے ہم عمر کزن میں محمد رفیع نے سب سے پہلے فلمیں دیکھنی شروع کی۔ ان کے ماموں زاد بھائی فاروق احمد پرانے شہر میں واقع اپنے گھر سے ہر جمعہ کو فلم دیکھنے سونہ وار آتے اور انہیں ساتھ لے کر سنیما جاتے۔ ان دنوں براڈوے سنیما نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ اکثر فلم بین سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں سے پوچھتے براڈوے کو کون سا راستہ جاتا ہے؟ نہ جانے مجھے کیوں یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ اس طرح جوق در جوق سنیما دیکھنے آتے ہیں۔ میں اگلی بار پوچھنے والے کو غلط راستے پر ڈالنے کی سوچتا لیکن ہر مرتبہ صحیح راستہ ہی بتا دیتا۔ خود میں نے کالج میں پڑھائی کے دوران ہی فلمیں دیکھنی شروع کی جس میں محمد رفیع ہمیشہ ساتھ ہوتے۔ دراصل ہمارے ایک مشترکہ دوست اور ہم جماعتی عبدالسلام، جن کا ہاتھ کشادہ تھا، ہمیں فلمیں دکھانے لے جاتے اور ساتھ ہی سٹیفڈ پف کے ساتھ چائے بھی پلاتے۔ ان دنوں میں نے ان تمام فلموں کی فہرست تیار کی تھی جو میں نے دیکھی تھیں۔ یونیورسٹی اور ملازمت کے ابتدائی برسوں میں یہ شوق باقی رہا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس میں کمی آ گئی اور آج کئی برس ہوئے ہیں کوئی فلم دیکھے ہوئے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ آخری مرتبہ سنیما کب گیا تھا۔ ایسی ایک فلم ہے جو میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یعنی چار دفعہ دیکھی ہے اور وہ ہے ''امراؤ جان''۔

اسکول میں داخلے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ اکثر بچوں کی طرح میں نے بھی پہلے پہل اسکول جانے میں آنا کانی کی۔ گھر والوں کی کوششیں رنگ لاتے ہوئے نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ایک دن والد صاحب نے تنگ آ کر ایک چھڑی اور مٹی کا ایک برتن میرے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ اگر اسکول نہیں جانا ہے تو یہ پکڑو اور جا کر مویشی

چڑاؤ۔اس ایک جملے نے صورت حال ہی بدل دی اور مجھے اتنا جھنجھوڑ دیا کہ میں اسکول جانے پر راضی ہو گیا۔ہمشیرائیں کہتی ہیں کہ والد صاحب کے اس طنز یہ جملے نے میرے حساس ذہن پر کچو کے لگا دیئے۔آج تک یہ حساس طبیعت میرا سرمایہ بھی ہے اور کمزوری بھی۔اسکول میں داخلہ کے لئے چچا کے ساتھ بھیجا گیا۔ان کے فرزند جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال بڑے ہیں، بھی اپنے داخلہ کے لئے ساتھ تھے۔مجھے چھوٹا اوّل میں جبکہ اسے بڑا اوّل میں داخل کر دیا گیا۔اس زمانے میں بچوں کو پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کیا جاتا تھا۔اسکول ریکارڈ میں دونوں کے ایام پیدائش میں صرف ایک ماہ کا فرق رکھا گیا۔میں اساتذہ کا پسندیدہ طالب علم تھا اور کئی اساتذہ کے ساتھ مجھے بھی عقیدت کی حد تک محبت تھی۔ان میں سب سے پہلے نمبر پر ہیڈ ماسٹر غلام حسن گیلانی صاحب تھے، جنہوں نے پورے علاقے میں ایک اساطیری کردار کا درجہ حاصل کیا تھا۔وہ اساتذہ کے لئے ایک بہترین نمونہ تھے اور انہیں صدر ہند نے حسنِ کارکردگی پر انعام سے بھی نوازا تھا۔ان کا دبدبہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔سارا علاقہ انہیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔سالانہ رزلٹ کے دن وہ اسکول کے آنگن میں وقفے وقفے سے پانی پی کر انفرادی طور پر ہر جماعت کے ایک ایک بچے کا رزلٹ پڑھ کر خود سناتے۔اس دن سارا علاقہ اسکول میں اُمڈ آتا۔اگر چہ میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا لیکن رزلٹ کے دن جیسے دل کی دھڑکنیں رک ہی جاتیں۔ان کا رزلٹ سنانے کا انداز نرالا تھا۔

بڑے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ گورنمنٹ لوور ہائی اسکول سونہ وار پہلے گیلانیہ مڈل اسکول کے نام سے ایک پرائیوٹ اسکول تھا جہاں انہی ہیڈ ماسٹر صاحب کی وجہ سے تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے بچے مشنری اسکولوں کے بچوں کے ساتھ انگریزی زبان میں ڈراموں کے مقابلوں میں

حصہ لیتے اوراعزاز حاصل کرتے ۔اسکول میں ایک بلیک بورڈ تھا جس پر مڈل کا امتحان، جواُن دنوں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے لیا جاتا تھا، میں امتیاز کے ساتھ پاس کرنے والے طلبا کے نام درج تھے۔ان میں بھائی صاحب کا نام بھی تھا۔جب میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا تو ہیڈ ماسٹر صاحب کا پانپور کے اسکول میں تبادلہ کر دیا گیا جس پر سونہ وار، درگجن ،گگری بل ،بٹہ وارہ اور شیو پورہ کے لوگوں نے احتجاج کیا اور ایک بڑا جلوس نکال کر اس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی رہائش گاہ واقع گگری بل گئے اور تبادلہ کے حکم کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔بدقسمتی سے صادق صاحب کو ہیڈ ماسٹر صاحب کی یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے نخوت سے کہا کہ جو طلبا ان سے پڑھنا چاہتے ہیں وہ اس اسکول میں داخلہ لیں جہاں ان کا تبادلہ ہوا ہے۔اس دن سارے علاقے پر مایوسی چھائی رہی۔

اسکول میں میرے پسندیدہ اساتذہ میں غلام احمد راتھر صاحب، عادل بشیر صاحب، غلام سرور صاحب اور سید صاحب تھے۔ماسٹر غلام محمد صاحب اور رفیق علی صاحب غلطی پکڑنے پر طلبا کی خوب مرمت کرتے اور اکثر بچے ان کے تبادلے کی دعائیں کرتے۔ماسٹر مکھن لال جی کلاس میں بچوں سے کہتے کہ آنکھیں بند کرو اور خواب دیکھ کر بتاؤ کہ کیا دیکھا۔یہ کہہ کر وہ خود کرسی پر بیٹھے سو جاتے۔جب کلاس ختم ہونے کو آتا تو وہ آنکھیں موندتے ہوئے جاگ جاتے اور ہر بچے سے پوچھتے بتاؤ کیا خواب دیکھا؟ بچارے بچے جاگتے کیا خواب دیکھتے مگر ماسٹر جی کے سوال کا جواب تو دینا ہی ہوتا تھا۔چنانچہ بچے سانپ، گھوڑا وغیرہ دیکھنے کا سوانگ بھرتے اور ماسٹر جی کا پیریڈ ختم ہوتا۔ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں کلاس میں سوتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا اور خوب کھری کھری سنائی۔ہائی اسکول بادامی باغ میں ہیڈ ماسٹر غلام علی شہید سلمانی صاحب، علی خان صاحب، اشوک کمار جی اور عبدالغنی مسعودی میرے

پسندیدہ اساتذہ تھے۔عادل بشیر صاحب آٹھویں جماعت میں میرے فارم ماسٹر تھے۔ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مارکس کارڈ آج بھی میری متاع عزیز ہے جس میں انہوں نے میرے بارے میں لکھا تھا ''The Boy Is A Shining Star''شہید سلمانی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رقعہ بھی میرے پاس قیمتی اثاثہ کی صورت میں محفوظ ہے جس میں انہوں نے میٹرک کے میرے مارکس کارڈ میں انگریزی زبان میں ۱۵۰ نمبرات میں سے صرف ۸۸ نمبرات دیکھ کر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے سیکریڑی سے میرے نمبرات دوبارہ چیک کرانے کی گزارش کی تھی۔ان کے لکھے ہوئے یہ الفاظ میرے لئے کسی بڑے انعام واکرام سے کم نہ تھے۔ He in no case deserves 88 marks only in English as he is the best boy of the school . مارکس کارڈ میں اگرچہ مجموعی نمبرات برابر ۵۵۳ درج تھے لیکن انفرادی مضامین کے مارکس جمع کر کے نمبرات کا حاصل کم آتا تھا۔میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی چٹھی لے کر سائیکل پر سوار بورڈ کے دفتر واقع لال منڈی گیا جہاں سیکریڑی ،جن کا نام غالبًا یوسف صاحب تھا، نے متعلقہ ملازم کو طلب کر کے فوری جانچ کرنے کا حکم صادر کیا۔ پتہ چلا کہ انگریزی کے مضمون میں ۱۲۶ نمبرات کے بجائے غلطی سے میرے مارکس کارڈ میں صرف ۸۸ نمبرات درج کئے گئے تھے جو دراصل میرے ایک ہم جماعت کے اس مضمون میں حاصل کردہ نمبرات تھے۔

میرے کزن محمد رفیع اسکول اور کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ہم دونوں اکھٹے اسکول جاتے اگرچہ یہ مرحلہ میرے لئے ہمیشہ صبر آزما ہوتا۔میں ہر صبح وقت پر تیار ہوکر، وردی پہن کر اور کتابوں کا بستہ کمر میں لٹکائے ان کے گھر جاتا لیکن ہر بار پتہ چلتا کہ وہ ابھی تیار ہی نہیں ہوئے ہیں۔تیار ہونے میں انہیں کافی وقت لگتا اور بالآخر جب ان کی اماں انہیں تیار کرتی، غسل خانے میں دیوار میں لگے آئینے میں

دیکھ کر پانی سے بالوں کو سنوارتی تو اس میں اچھا خاصا وقت صرف ہوتا۔میری حالت پطرس بخاری کے مشہور مزاحیہ انشائیہ ''سنیما کا عشق'' کے میر صاحب ایسی ہوتی جو ہر جمعرات کو فلم دیکھنے کی غرض سے اپنے دوست میرزا صاحب کے گھر جاتے اور بڑے جتن کے بعد انہیں ساتھ لے کر جب سنیما کی طرف نکلتے تو راستے میں ہر چار قدم پر میرزا صاحب رک رک کر لوگوں سے حال احوال پوچھتے اور میر صاحب فلم کا وقت نکلتے ہوئے دیکھ کر ہر بار قسم کھاتے کہ اگلی مرتبہ اکیلے سنیما دیکھنے جائیں گے۔اگلی صبح میں بھی پھر اسی مرحلے سے گزرنے کے لئے اپنے کزن کے گھر جاتا۔اسکول میں داخلے کے ابتدائی دنوں میں اپنی جماعت کی بجائے برادر محمد اسماعیل جو مجھ سے دو تین جماعتیں آگے تھے، کی جماعت میں بیٹھتا تھا۔ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے وہاں پا کر ٹوکتے ہوئے بھائی صاحب سے پوچھا اس سہروردی کو کہاں سے لائے ہو؟ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے سہروردی کیوں کہا۔میں نے واسکٹ پہنا تھا شاید اس وجہ سے انہوں نے مذاق کیا۔ان دنوں پاکستان کے وزیراعظم حسن شہید سہروردی تھے۔اس سرزنش کے اگلے روز سے میں اپنی کلاس میں بیٹھنے لگا۔

میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں اور اسکول میں اوّل آ کر پاس کرنے کے بعد میں نے وادی کے قدیم ترین کالج ''ایس۔پی کالج'' میں داخلہ لیا جہاں میرے مضامین انگریزی، تاریخ اور سیاسیات رہے۔1975ء میں بی۔اے۔آنرس کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد میں نے کشمیر یونیورسٹی میں دخلہ لیا اور 1977ء میں سیاسیات کے مضمون میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے قبل میں نے ۱۹۷۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے سوشیالوجی میں داخلہ لیا تھا اور قریباً ڈیڑھ ماہ تک وہاں زیر تعلیم رہا۔ادھر ساتھ ہی میں نے کشمیر یونیورسٹی میں بیک وقت اردو، قانون اور سیاسیات

کے شعبوں میں داخلے کی عرضیاں بھی داخل کی تھیں اور تینوں شعبوں میں منتخب امید واروں میں میرا پہلا نام نکلا۔علی گڑھ میں قیام کے دوران میں سخت بیمار رہوا۔شاید ملیریا کا حملہ تھا۔چنانچہ مجھے بڑے بھائی صاحب کی طرف سے ایک تار ملا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ فوراً گھر واپس آ ؤ۔اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔میں ٹرین میں سوار ہو کر علی گڑھ چھوڑ کر آ گیا۔میں ایسی قوت برداشت کا مالک نہیں ہوں اور ذرا سی تکلیف اور مشکل مجھے بے حد پریشان کر دیتی ہے۔علی گڑھ سے واپسی کے بعد میں نے کشمیر یونیورسٹی میں قانون اور اردو کی بجائے سیاسیات کے شعبے میں داخلہ لیا جہاں نیاز احمد آخری سال کے طالب علم تھے۔ان کی موجودگی سے میں ریگنگ جیسے عذاب سے بچ گیا جبکہ میرے ہم جماعتوں کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا۔میرا تعلیمی ریکارڈ اس لحاظ سے اچھا رہا کہ چھٹی جماعت سے جب سے میرے مارکس کارڈ میرے پاس موجود ہیں، میں نے ہر امتحان امتیازی نمبرات سے اسکول اور کالج میں اوّل رہ کر پاس کیا۔ایم۔اے کے امتحان میں البتہ یہ امتیاز برقرار نہ رکھ سکا اور یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم کے علاوہ میرا کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ البتہ لڑکپن اور نوجوانی میں محلّے کے دیگر لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا۔گھر کے نزدیک واقع ریڈنگ روم کے پیچھے خالی زمین پر میں نے لڑکپن میں بہت کرکٹ کھیلی ہے جہاں ہماری وکٹ بجلی کا کھمبا ہوتا تھا۔ مجھے بیٹنگ کرنے کا شوق تھا اور اڑوس پڑوس کے معیار کے مطابق فاسٹ باولر تھا۔ایک بار کالج میں ہم جماعتوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے سات وکٹیں لیں۔میرے ہم جماعت جو مجھے صرف بحیثیت ''پڑھاکو'' جانتے تھے،اس کارنامہ پر حیران ہوئے۔خورشید شیر خان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ارے یار تم تو چھپے رستم نکلے۔خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔حقیقت یہ ہے

کہ میں نے کبھی کوئی کھیل کھلاڑی بننے کی نیت سے نہیں کھیلا۔ کرکٹ کے کھیل سے البتہ ہمیشہ دلچسپی رہی خصوصاً دیکھنے کی حد تک۔

میرے لڑکپن کے دنوں میں سونہ وار میں کرکٹ کے میدان میں سالانہ رانجی ٹرافی چمپین شپ کے میچ منعقد ہوتے تھے، جہاں بھارت کی مختلف ریاستوں کی کرکٹ ٹیمیں جموں وکشمیر کی ٹیم کے ساتھ کھیلنے آتی تھیں۔ ان میں سابق اور موجودہ ٹیسٹ کھلاڑی بھی ہوتے۔ ایسے ہی کھلاڑیوں میں کے۔ ایچ۔ ٹی۔ وانی بھی تھے جنہوں نے 1960ء کی دہائی میں پاکستان کے خلاف کھیلا تھا اور اس نسبت سے ان کی اوپری جیب پر ایک بیج لگا رہتا تھا۔ دیگر نامور کھلاڑیوں میں کامیاب اسپن باؤلر بشن سنگھ بیدی اور میڈیم پیس باؤلر مدن لال تھے۔ ایک میچ کے دوران جموں وکشمیر کی ٹیم کے کپتان عبدالرؤف نے بیدی کی باؤلنگ کی کرکری کر دی اور چوکوں اور چھکوں کی بارش کر کے 96 رَن بنائے۔ عبدالرؤف کشمیر کے سب سے معروف آل راونڈر اور تماشائیوں کے محبوب کھلاڑی تھے۔ ان کو کھیلتے دیکھنے کے لئے دور دراز سے لوگ آتے اور جتنی دیر وہ بیٹنگ یا باؤلنگ کرتے لوگوں کی دلچسپی قائم رہتی۔ اس کے بعد اکثر اٹھ کر چلے جاتے۔ عبدالرؤف لمبے قد کے خوبرو نوجوان تھے، جن کے مدحواں میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص بھی تھا، جو پاکستان کے مشہور ''چاچا کرکٹ'' کی طرح ہر دن ان کا کھیل دیکھنے آتا اور انہیں Buck up کرتا۔ کرکٹ کے ان مقابلوں کے دوران میں اور میرے بعض کزن سارا دن کرکٹ میدان میں گزارتے۔ جب ایمپائر لنچ کا اعلان کرتا تو ہم بھی کھانا کھانے گھر آتے۔ اسی طرح چائے کے وقفے میں ہم جلدی جلدی گھر سے چائے پی کر میدان میں لوٹ آتے۔ بچپن میں، میں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہوئی کرکٹ سیریز کا تصویری البم بنایا تھا جس میں حنیف محمد، محمد حسین، امتیاز احمد، انتخاب عالم ایسے کھلاڑیوں کی کئی تصویریں موجود

تھیں۔ ایسا ہی ایک اور البم ان تصاویر پر مبنی تھا جو امریکہ کے خلائی شٹل اپالو، کے کئی بار چاند پر اترنے سے متعلق تھیں۔ یہ دونوں البم بہت دنوں تک میرے پاس تھے لیکن ۲۰۰۳ء میں نقل مکانی کے وقت کہیں کھو گئے، تسخیر قمر کے فوٹو میں نے ریڈنگ روم کے اخباروں سے نظریں بچا کر جمع کئے تھے۔

کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد میرے لئے ابھی روزگار کا وسیلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ 1979ء کا سال تھا کالم نویس جی۔ ایم زاہد، ان دنوں محکمہ اطلاعات میں ملازم تھے۔ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ منظور احمد کے دوست ہیں اور اس ناطے میرے بھی ان سے مراسم تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ روزنامہ ''افتاب'' کو ادارتی عملے کے لئے ایک نوجوان کی تلاش ہے جسے اردو زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہو اور صلاح دی کہ مجھے وہاں جانا چاہیے۔ چنانچہ میں ان کے دفتر گیا جہاں سے ان کے افسر مظفر احمد خان مجھے ادارہ ''آفتاب'' میں لے گئے اور مدیر خواجہ ثناءاللہ بٹ سے متعارف کرایا۔

خواجہ صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی حالانکہ روزنامہ ''آفتاب'' کے قارئین کے لئے میں غیر معروف نہ تھا۔ میرا اور ''آفتاب'' کا رشتہ سات سال قبل جڑا تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو جب میں ایس۔ پی۔ کالج کا طالب علم تھا، میری پہلی کہانی ''انوکھا ملن'' روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی تھی۔ وہ لمحہ آج بھی میرے حافظے میں تازہ ہے۔ ان دونوں ہمارے یہاں اخبار یا تو دوستہ خالق مرحوم کے سیلون میں آتا تھا یا پھر مرحوم کمال صوفی کی دکان پر۔ سیلون میں جا کر اخبار پڑھنا میری ہمت سے باہر تھا کیوں کہ وہاں محلّہ کے تمام بڑے اور بزرگ حقے کے کش لے لے کر پرچہ باری باری پڑھتے اور چٹخارے لے لے کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے۔ اس محفل میں ایسے نوجوان کا جانا اور اخبار مانگ لینا حدِ ادب سے باہر تھا۔

اسی زمانے میں، میں نے ایک کہانی لکھ کر''آ فتاب'' میں اشاعت کے لئے بھیجی تھی اوراب مجھے بے چینی سے انتظار تھا کہ کہانی اخبار میں شائع ہو۔جب ''آ فتاب'' میرے ہاتھوں میں آیا اور پہلے صفحے پر سرسری نظر ڈال کر میں نے اخبار کا ورق الٹا تو نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا بلکہ پورے جسم پر عجیب قسم کی کپکپی چھاگئی۔ یہ خوشی کا کیسا احساس تھا مجھے آج تک معلوم نہیں۔ان دنوں''آ فتاب'' چار صفحات پر شائع ہوتا اور دوسرے صفحہ کے دوتہائی حصے پر میری کہانی چھپی تھی''انوکھا ملن'' تحریر خالد بشیر سونہ وار سرینگر۔ یہ ادبی دنیا سے میرا پہلا تعارف تھا۔اس کے بعد میری کہانیاں متواتر''آ فتاب'' میں چھپی اور پھر جب میرا میلان شاعری کی طرف بڑھا تو میری غزلیں اور نظمیں بھی پہلے اسی اخبار کی وساطت سے ہی سامنے آئیں۔ان دنوں کا یہ شعر میرے حافظے میں اب بھی تازہ ہے۔

سسکتی رہی ہیں، تڑپتی رہیں   مگر آرزوئیں مچلتی رہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب''آ فتاب'' نے کشمیر کی ادبی دنیا سے کئی نئے نام متعارف کرائے تھے۔ان دنوں جو اصحاب تواتر سے چھپتے تھے ان میں عمر مجید، م۔م۔صدیق اور ایس ایم قمر تینوں میرے ہم محلّہ تھے۔ان کے مقابلے میں، میں نوآموز تھا۔بشیر گاش، شمس الدین شمیم، محمد یعقوب بافندہ، یٰسین فردوسی، نذیر مشتاق بڑی باقاعدگی کے ساتھ چھپتے تھے۔ان کے علاوہ بھی کئی نام تھے جنہیں اس وقت میں بھول رہا ہوں ۔امید ہے میرے وہ دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔بہرحال مجھے ادارہ''آ فتاب'' میں رکھا گیا اور اولاً خبر رساں ایجنسیوں یو۔این۔آئی اور پی۔ٹی۔آئی کی کچھ خبریں ترجمہ کرنے کو دی گئیں۔میں نے فوراً ترجمہ خواجہ صاحب کے پاس بھجوادیا۔خواجہ صاحب نے سرخیاں جمادیں اور خبریں اخبار میں چھپ گئیں۔ان دنوں بڈشاہ چوک میں اخبار کا دفتر جیسا کہ شاید آج بھی ہے، تین کمروں اور ایک راہداری پر مشتمل

تھا۔ پہلے کمرے میں ادارے کا منیجر اور دیگر اسٹاف، دوسرے میں مدیر ''آفتاب'' اور تیسرے میں اخبار کے خوش نویس حضرات بیٹھتے تھے۔ ادارتی عملے میں طاہر محی الدین اور یوسف جمیل مستقل رکن تھے۔ یوسف جمیل، خواجہ صاحب کے بالمقابل بیٹھتے تھے اور خبروں اور دیگر کالموں کے لئے خواجہ صاحب سے ڈکٹیشن بھی لیتے اور خود بھی خبریں تیار کرتے تھے۔ طاہر محی الدین راہدری میں براجمان تھے اور میری نشست بھی وہیں مقرر ہوئی۔ یوسف جمیل ان دنوں خواجہ صاحب کے خاص الخاص تھے۔ ان کی بات کا پاس رکھا جاتا تھا۔ اس سے قبل طاہر محی الدین کو یہ مرتبہ حاصل تھا جبکہ ان سے قبل غلام نبی رتن پوری اس منصب پر فائز تھے۔ رتن پوری میرے ادارہ جوائن کرنے سے قبل وہاں سے جا چکے تھے۔ مجھے ''آفتاب'' میں ایک اچھا اور دوستانہ ماحول میسر آیا۔ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل دونوں شفقت کی حد تک مجھ سے مانوس ہوئے تھے۔ یوسف جمیل کی شرافت اور قابلیت دونوں مسلم تھیں۔ اول الذکر سیاست پر خامہ فرسائی کرتے تھے جبکہ آخر الذکر زیادہ تر اسلامی اور فلمی صفحات ترتیب دیتے تھے۔ جمیل صاحب کے ذمہ اتوار کو شائع ہونے والا بارہ صفحات Tabliod سائز ہفتہ وار شمارہ بھی تھا۔ میں بھی اس کے لئے خبروں کے علاوہ مضامین اور فیچر لکھتا تھا۔

میرے ادارہ ''آفتاب'' میں آنے کے تیسرے یا چوتھے روز خواجہ صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں راہداری میں نکلنے والے دروازے سے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ غالباً وہ اس وقت اکیلے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوئے، میں نے تمہارا کام دیکھا۔ دو تین دن میں ہی تم نے اچھی طرح سے Pick up کیا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرو کہ آیا تم یہاں کام کرو گے۔ میرے لئے یہ الفاظ بے حد حوصلہ افزا تھے۔ چنانچہ مجھ میں اعتماد ظاہر کرنے پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جواباً عرض کیا کہ میں کام کرنے کی غرض سے ہی آیا ہوں۔ یہ کہہ کر میں

واپس اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔

بچپن سے جب سے میں روزنامہ ''آفتاب'' پڑھتا تھا، خواجہ ثناءاللہ بٹ کی شخصیت کا ایک اسطوری خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ ''آفتاب'' محلّہ محلّہ قصبہ قصبہ پڑھا جاتا تھا اور سرینگر شہر میں تو ان لوگوں کے لئے جنہیں اخبار خریدنے کی استطاعت تھی وہ ناشتے کے دوران اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ دیگر لوگ اکثر حجاموں کی دکانوں پر لگنے والی بیٹھکوں میں یا ریستورانوں میں اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ شہر میں خال ہی نائی کی دکان ہوگی جہاں ''آفتاب'' نہ آتا ہو اور یوں یہ دکانیں کیمونٹی ریڈنگ روم کے طور پر استعمال ہوتیں۔ ''آفتاب'' میں چھپنے والی خبروں اور مضامین کو لوگ اعتبار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ''خضر سوچتا ہے، ولر کے کنارے'' ایسے مزاحیہ کالم کو بھی حقیقت تسلیم کر لیتے۔

''آفتاب''میں میرے قیام کا وقت افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت اور قبضے کا دور تھا۔ سوویت استبداد اور ظلم و جبر کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے قصّے یا تو بی۔ بی۔ سی کے ذریعہ یا مغربی اخباروں اور جرائد کی وساطت سے لوگوں تک پہنچتے تھے۔ روزنامہ ''آفتاب'' افغانیوں کی جرأت اور جواں مردی کے قصّے بڑے چاؤ اور کسی حد تک عقیدت مندانہ طریقے پر شائع کرتا تھا۔ اِنہی دنوں جو کہ 'آفتاب' میں میرے ابتدائی ایّام تھے امریکی جریدے 'ٹائم'' میں افغانستان پر سوویت حملے اور سرخ فوج کی عسکری قوت کے بارے میں ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اس مضمون کو اخبار میں نقل کرنا چاہتے تھے چنانچہ ترجمے کا کام مجھے سونپا گیا جسے میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل کر دیا۔ اس ترجمے نے اُن کی نظروں میں میری وقعت بڑھا دی۔ دوسرے روز یہ مضمون اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوا لیکن ترجمہ نگار کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بہر حال مجھے یہ تسلی رہی کہ یہ کام میں نے ہی کیا

ہے۔اس کے بعد خواجہ صاحب نے مجھے اپنی زیرِ ترتیب کتاب ''کشمیر 1947ء سے 1977ء تک'' کے دو تین ابواب انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے دیئے۔ وہ کتاب کا انگریزی پرنٹ شائع کرنا چاہتے تھے۔ترجمے کا کام صحافی ایم۔ ایل۔ کاک کر رہے تھے اور خواجہ صاحب کی نظر میں یہ دو تین ابواب بڑے دھماکہ خیز تھے۔

میرے اوقاتِ کار صبح دس بجے سے رات کو نو بجے تک تھے۔دن بھر طاہر محی الدین، یوسف جمیل اور میں ٹیلی پرنٹر روم سے اہم خبریں منتخب کر کے اُن کا ترجمہ کرتے اور وادی کے مختلف حصوں سے حاصل ہونے والی رپورٹوں اور پریس نوٹس سے خبریں تراش کر مدیر ''آفتاب'' کی میز تک پہنچاتے جو حسب ضرورت ایڈیٹنگ کر کے سرخیاں جما کر خوشنویسوں تک پہنچوا دیتے۔دن بھر کی مشقت کے باوجود تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا کیونکہ پورا عملہ ایک دوستانہ ماحول میں کام کرتا تھا۔

میری پہلی Outdoor Assignment ایک پریس کانفرنس تھی جس سے گورنر جموں و کشمیر، ایل کے جھا، راج بھون، چشمہ شاہی میں خطاب کرنے والے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ صحافیوں کو محکمہ اطلاعات کی طرف سے گورنمنٹ پریس بلڈنگ سے راج بھون تک لے جایا جائے گا۔محکمہ اطلاعات کے صوبائی دفتر میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بتایا گیا کہ مجوزہ پریس کانفرنس ملتوی کی گئی ہے۔اس کے بعد پہلی بار کسی واقعہ کی رپورٹنگ کرنے کا موقع مجھے اُس وقت ملا جب حکمران جماعت نیشنل کانفرنس آنے والے پارلیمانی ضمنی انتخابات کے لئے اپنے اُمیدواروں کا عوامی اجتماع میں اعلان کرنے والی تھی۔ یہ اجتماع مجاہد منزل میں تھا اور ناموں کا اعلان سہ پہر کو خود وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبد اللہ کرنے والے تھے۔ایک بڑا سٹیج تیار کیا گیا تھا جس پر شیخ صاحب کے علاوہ پارٹی کے دیگر زعما براجمان تھے۔ مجھے بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ اسٹیج پر جگہ ملی۔شیخ صاحب کو اتنا قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔

میں اس خیال سے کہ جلسے کی کارروائی کا کوئی حصہ نہ چھوٹے، بہت پہلے ہی مجاہد منزل پہنچ گیا تھا اور جب تک کہ جلسہ اختتام پذیر ہوا اور شیخ صاحب نے پارٹی کے امیدواروں کو عوام سے متعارف کرا کے اپنی تقریر ختم کردی۔ شام رات کی دہلیز پر دستک دے چکی تھی۔ میں جلدی جلدی واپس دفتر پہنچا، شیخ صاحب کی تقریر اور جلسے کی کارروائی پر خبر تیار کی جو نسبتاً طویل تھی اور خواجہ صاحب تک پہنچا کر گھر لوٹا۔ صبح جب اخبار دیکھا تو میری تحریر کردہ خبر ''آفتاب'' کی شہ سرخی تھی اور اس سے زیادہ حیرت اور مسرت کی بات یہ تھی کہ خبر کے ساتھ بائی لائن بھی شائع ہوئی تھی۔ خالد بشیر، نمائندہ خصوصی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس طرح ''آفتاب'' میں کسی رپورٹر کی بائی لائن شائع ہوئی ہو۔ وادی سے چھپنے والے دیگر اخباروں کی تو بات ہی نہیں۔ اب تک صرف مضامین، تبصروں، تجزیاتی رپورٹوں یا مستقل کالموں کے ساتھ ہی کالم نگار کا نام آتا تھا۔ نامہ نگار کی حیثیت سے یہ افتخار میرے حصے میں تھا۔ خواجہ صاحب میرے کام سے خوش تھے۔ اس کا احساس مجھے تھا اور یہ بات بھی صاف تھی کہ مجھ پر اُن کا اعتماد بڑھ گیا تھا۔

مجھے ایک دل کو چھو لینے والا اور بڑے دنوں تک میرے احساس پر چھائے رہنے والا واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں حسب معمول دفتر میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ کسی نے، غالباً عبدالسلام تھے، اطلاع دی کہ کوئی خاتون باہر تمہیں پوچھ رہی ہیں۔ میں حیرت اور اشتیاق کے تاثرات لے کر باہر والے کمرے میں گیا تو وہاں ایک پنجابی مسلم بزرگ خاتون منتظر تھی۔ عمر رسیدہ، چہرے پر جھریاں اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی محبت جو صرف ماؤں کا حصہ ہے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ میں ہی خالد بشیر ہوں جنہیں تلاش کرتے ہوئے وہ یہاں آئی ہیں۔ وہ خاتون والہانہ طور پر مجھ سے ملیں، میرا ماتھا چوما اور مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ اُنہوں

نے کیا الفاظ کہے تھے لیکن وہ مجھے دعائیں اور شاباشی دے رہی تھیں، یہ کہہ کر کہ میں یونہی لکھتا رہوں۔ میرے لئے وہ لمحات نہایت انمول تھے اور یہ ایسی حوصلہ افزائی تھی جو میرے وہم وگماں سے بھی زیادہ تھی اور جس کا اثر بڑے دنوں تک باقی رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ خاتون کون تھیں لیکن جس شفقت اور محبت کا انہوں نے اظہار کیا تھا وہ یقیناً کسی بڑے سے بڑے انعام سے بھی فزوں تھا۔

میرے شعری کارٹونوں کو بے حد سراہا گیا، اگر چہ خواجہ صاحب نے قارئین کی پسندیدگی کا مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا سوائے اُس دن جب شیخ صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ وہ اپنی کابینہ میں وزرا کی تعداد کم کر رہے ہیں، اُنہوں نے اس کے برعکس ایک وزیر کا اضافہ کر دیا۔ اس سے قبل کابینہ میں وزرا کی متوقع کمی سے جونیئر وزرا تذبذب کی حالت میں تھے اور افواہوں کا بازار گرم تھا کہ فلاں وزیر گیا، فلاں کا پتہ کٹا۔ میں نے اس واقع پر یہ شعری کارٹون تحریر کیا۔

شیخ صاحب کے اشاروں کو سمجھنا چاہئیے
خوامخواہ چھوٹے وزیر اُن کے بیان سے ڈر گئے
کر رہے تھے گر چہ وہ تخفیفِ کابینہ کی بات
کرتے کرتے اِک منسٹر کا اضافہ کر گئے

اُس روز دفتر پہنچتے ہی خواجہ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ قطعہ پسند کیا گیا اور مجھے ''آفتاب'' کے محبّ حاجی محمد جمال صاحب نے کہا ہے کہ تمہیں اس کے لئے مبارکبا ددوں۔

1980ء کے ابتدائی مہینے تھے، ایک روز میں اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں رات کو ٹھہرا تھا۔ اُن دونوں ہفتے میں ایک مرتبہ دُور درشن سرینگر سے روز گار بلیٹن ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ اُس روز کے بلیٹن میں انفارمیشن آفیسروں کی اسامیوں کے لئے

درخواستیں دینے کی پہلے ہی نشر شدہ ''آخری تاریخ'' بڑھائے جانے کا اعلان کیا گیا۔اس سے پہلے میں نے اس بارے میں نہیں سنا تھا۔چنانچہ اسامیوں کے لیے قابلیت کا جو معیار مقرر تھا، میں اس پر پورا اُترتا تھا۔اگلے دن میں نے مقررہ فارم وصول کرکے درخواست دی۔اس کے بعد انٹرویو کے لئے بلاوا آ گیا۔پھر میری تقرری کا حکم نامہ آیا۔

16/اپریل 1980ء کی سہ پہر کو دفتر میں میرے لئے فون آ گیا۔دوسری طرف جی۔ایم زاہد تھے جنہوں نے مجھے اطلاع دی کہ انفارمیشن افسر کے طور میری تقرری کا حکم جاری ہوا ہے اور میں آ کر نوکری جوائن کرلوں ۔ میں محکمۂ اطلاعات میں نوکری کا حکم نامہ لینے گیا جوائن کرنے کے لیے کہا گیا۔میں خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے نکل آیا۔اپنی حساس طبیعت کے باعث میں نے پھر کبھی مڑ کر اُس طرف نہیں دیکھا۔اُن کے انتقال سے قبل البتہ جب 2008ء میں، میں نے محکمہ اطلاعات کے ناظم کا عہدہ سنبھالا تو دو مرتبہ اُن سے ملنے گیا۔ایک مرتبہ سرینگر میں اور دوسری مرتبہ جموں میں۔ یہ 28 سال کے بعد ہماری پہلی ملاقات تھی۔وہ علیل تھے اور اُنہوں نے کسی قسم کی رنجش کا احساس نہیں دلایا۔

روزنامہ ''آفتاب'' کے ساتھ مختصر وابستگی کے بعد اپریل 1980ء میں میرا تقرر حکومت جموں و کشمیر کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں بطور انفارمیشن آفسر ہوا۔یہاں میں نے ماہنامہ ''تعمیر'' اور پندرہ روزہ ''مکتوب'' کی ادارات سنبھالی۔اس دوران ''تعمیر'' کے کئی خصوصی نمبر شائع کئے جن میں ''جموں و کشمیر میں اُردو ادب نمبر''، ''پریم چند نمبر'' اور ''مہجور نمبر'' کی خاصی پذیرائی ہوئی۔محکمہ اطلاعات میں پبلک ریلیشنز' ایڈورٹائزنگ اور پبلی کیشنز کے شعبوں کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد جولائی 2008ء میں ناظمِ اطلاعات کی حیثیت سے اسی محکمہ کے

سربراہ کا عہدہ سنبھالا۔جن دیگر عہدوں پر کام کیا اُن میں ڈائریکٹر لائبریریز اینڈ ریسرچ، ڈائریکٹر آرکائیوز ،آرکیالوجی اینڈ میوز یمز، سپیشل سیکریٹری محکمہ ہاوسنگ اینڈاربن ڈیولپمنٹ،ایڈیشنل سیکریٹری ٹوچیف منسٹراور جوائنٹ ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ اینڈ رورل ڈیولپمنٹ شامل ہیں۔پھرسیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئجز کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

اُردوادب سے بچپن سے ہی شغف رہا گو کہ ہمارے خاندان میں شعر گوئی کا شوق رکھنے والا میں پہلا اور اب تک واحد فرد ہوں۔ادب کے میرے شوق کوسونہ وار میں ہمارے آبائی گھر کے سامنے واقع پبلک ریڈنگ روم نے خوب اُبھارا جہاں جانا میرا روز کا معمول تھا۔یہاں انگریزی اوراردواخبارات کے علاوہ کچھ ادبی رسالے بھی آتے تھے جن کے مطالعہ نے مجھے لکھنے پراُکسایا۔ابتدائی طور پرافسانے لکھے جومقامی اخباروں میں شائع ہوئے۔اُردوشاعری سے میرا میلان اس حد تک بڑھ گیا کہ میں نے افسانوں سے اپنی توجہ یکسر ہٹا کرشعرگوئی کی جانب مبذول کی۔ایس۔پی۔کالج میں دوران تعلیم میں کالج کی میگزین ''پرتاپ'' کے اُردوسیکشن کا ایڈیٹر رہا اور 2005ء میں کالج کے صدسالہ جشن کے موقع پر میرا تحریر کردہ ''کالج ترانہ'' ایک پُروقار تقریب میں جاری کیا گیا۔

1983ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے نیم شب'' منظرِ عام پرآیا جسے جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگوئجز کی جانب سے سال 1984ء کی بہترین اردو تصنیف کا ایوارڈ حاصل ہوا۔اُس وقت یہ انعام دو ہزار روپیوں پر مشتمل ہوتا تھا جسے عطا کرنے کے لئے کوئی تقریب منعقد نہیں کی جاتی تھی بلکہ انعام کی رقم کا چیک انعام پانے والے کے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔اب تو نہ صرف انعام کی رقم 51 ہزار روپے تک بڑھائی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ انعام یافتہ ادیب وشاعر کو ایک شال بھی

پیش کی جاتی ہے جس کے لئے ایک بڑی محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس مجموعے پر بر صغیر کے ادبی جرائد میں بڑے اچھے تبصرے آئے اور یوں یہ نام وسیع تر اُردو شعر و ادب کی دنیا میں متعارف ہوا۔ 2008ء میں میرا دوسرا شعری مجموعہ ''خواب پارہ'' شائع ہوا۔ پہلے اور دوسرے شعری مجموعے کے منظرِ عام پر آنے کے درمیان طویل وقفہ کا مؤجب میری دفتری مصروفیات بھی تھیں اور اس دوران میری توجہ کشمیر کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے پر مرکوز رہی۔ یہ مضامین ریاست اور ریاست سے باہر کے انگریزی اور اُردو اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ اسی دوران میں نے دریائے جہلم کے حوالے سے کشمیر کی ثقافت، ادب، اساطیر، تاریخ اور معیشت پر Jhelum-The River Through My Backyard کے نام سے انگریزی زبان میں کتاب لکھی جو 2001ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جسے بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی۔ 2008ء میں اس کتاب کا اضافے کے ساتھ ''دیدۂ آبِ رواں'' کے نام سے اُردو ایڈیشن شائع ہوا جس پر مقتدر مصنفوں اور کالم نگاروں نے بڑے اچھے تبصرے لکھے۔ اس کتاب کو جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کی جانب سے سال 2010ء کی بہترین اُردو تصنیف کا ایوارڈ ملا۔

مذکورہ کتاب کے لئے تحقیق کے دوران کشمیر کی تاریخ سے میری خاص دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشمیر کو اگرچہ پانچ ہزار برس کی تاریخ تحریری صورت میں موجود ہونے کا اعزاز حاصل ہے مگر ایک ایسی تاریخ اب تک لکھی نہیں گئی ہے جو شواہد اور حقائق کے حوالے سے علمی جانچ پر کھری اُترے۔ خاص طور پر قدیم اور وسطی دور کی تاریخ کئی لحاظ سے ناقص اور بعض اوقات بعید از حقائق ہے۔ چنانچہ کئی مافوق بڑھائے گئے ہیں، یہ سلسلہ آج بھی

جاری ہے۔تاریخِ کشمیر کے معتبر نمونوں کی اس لحاظ سے اعتباریت مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں بہت زیادہ مقدار میں دیو مالا، افسانہ، تعصب، حقائق سے پردہ پوشی اور مبالغہ جیسی خامیاں موجود ہیں۔قدیم کشمیر کی تاریخ نویسی میں دیو مالا کا بڑا دخل ہے۔ وسطی دور کی تاریخ میں ذاتی تعصب نے بڑی جگہ پالی ہے جبکہ جدید دور کی تاریخ نویسی یا واقعہ نگاری میں مبالغہ آمیزی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا معمول کی بات ہے ۔اِس صورت حال میں ایک صحیح اور شواہد پر پورا اُترنے والی تاریخ کا سامنے آنا ضروری ہے۔

کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے تاریخ دانوں نے اب تک اس طرف توجہ نہیں کی ہے اور کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے ایک مستند مطالعہ ابھی تک پیش نہیں ہوا ہے۔ میری کتاب ''کشمیر ایکسپوزنگ دی متھ بہانڈ دی نیراٹیو'' اسی سمت میں ایک کوشش ہے جس کا مقصد کشمیر کی تاریخ پر پڑی گرد صاف کر کے بعض تاریخی واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنا ہے۔ یہ کتاب تاریخِ کشمیر کے حوالے سے 'تسلیم شدہ' اور مقبول عام بیانیہ کو چیلنج کرتی ہے اور ایسے حقائق کو سامنے لاتی ہے جنہیں یا تو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے یا جن پر تاریخ دانوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔کتاب کشمیر کی تاریخ سے متعلق ایک مستند بیانیہ کی ضرورت اُجاگر کرتی ہے۔اِس کتاب کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کے بعض دلچسپ واقعات پر مشتمل میری ایک اور کتاب ''اے واک تھرو کشمیر ہسٹری'' بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔

اُردو میں اگر چہ میں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن اصل میں میرا میلان غزل کی طرف ہے اور شاعری میں اِسی صنف کو اپنا وسیلۂ اظہار بناتا ہوں۔میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی ہے اور شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ مشاعروں میں شامل نہیں ہوتا ہوں اگر چہ ابتدائی ایام میں کئی آل انڈیا

مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ادبی محفلوں سے کم وبیش دُور رہا ہوں۔اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں نام نہاد افراد اور انجمنوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا ہے اور اُنہوں نے ادب کو بھی جس طرح لپیٹ میں لیا ہے، اُس پر افسوس ہوتا ہے۔

1980ء کے آس پاس سرینگر میں بعض پُر خلوص احباب نے رائیٹرس کلب کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی جس کے ساتھ میں بھی سرگرمی سے وابستہ رہا۔اس تنظیم نے سرکردہ ادیبوں اور قلمکارں کے ساتھ کئی ادبی مجالس کا اہتمام کیا۔تنظیم سے وابستہ رفقا اپنی جیبوں سے اخراجات برداشت کر کے محافل کا انعقاد کرتے تھے۔بدقسمتی سے احباب کی انفرادی مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میرا قریبی حلقہء احباب مختصر ہے اگرچہ جان پہچان اور محبت رکھنے والے اصحاب کا دائرہ وسیع تر ہے۔میرے قریبی دوستوں میں کم وبیش سب نوکری پیشہ ہیں اور اکثر شعر و ادب سے شغف رکھنے والے حضرات ہیں۔میں جب کوئی نیا شعر یا غزل کہتا ہوں تو اکثر اوقات پہلے اُنہی کو سناتا ہوں۔میری غزلیں برصغیر کے اُردو جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔اگرچہ میں اپنا کلام کم ہی اشاعت کے لئے بھیجتا ہوں۔

طبیعتاً میں ایک کم گو شخص ہوں اور محفلوں سے کتراتا ہوں۔میری زندگی کے اِس پہلو سے میرے اکثر دوست نالاں ہیں۔میں فطرتاً شور شرابہ اور ہاؤ ہو سے دور بھاگتا ہوں ۔ میں کوئی متحرک قسم کا Activist نہیں ہوں۔مختلف موضوعات اور مسائل پر میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعہ کرتا ہوں جن میں میرے اشعار بھی شامل ہیں۔ میں کسی تنظیم یا تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں۔مسائل یا موضوعات پر اپنے دوستوں یا ہم خیال اصحاب کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا ہوں یا نظم و

نثر کی صورت میں قارئین کے ساتھ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ خالی اوقات میں اخبارات پڑھتا ہوں، کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں یا ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں۔ انٹرنیٹ پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور Surfing بھی میرا شوق ہے۔ فرصت کے لمحات گھر میں گزارنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ خوبصورت مقامات کی سیر کا البتہ بہت شوق ہے اور ایسا کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ہوں جہاں کسی پُرکشش جگہ جانے کا موقع فراہم ہو۔ اپنے کشمیر سے بے پناہ محبت ہے اور اس کی تاریخ کا ایک طالب علم ہوں۔

●●●

(خاؔلد بشیر احمد صاحب کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ اردو، جلد 55، نمبر 10-12 سے ماخوذ ہے، جو 2017 میں شائع ہوا ہے۔)

☆......دیپک کنول

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے

میرے والد کا نام پنڈت لسہ کول تھا۔ بڈگام کے بہت بڑے جاگیردار تھے۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر اُنہیں اُردو کے علاوہ فارسی زبان پر کسی قدر دسترس حاصل تھی۔ وہ مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ ہمیشہ دوسروں کی مدد کے لئے آگے رہتے تھے۔ جس محفل میں بھی بیٹھتے اُسے اپنے چٹکلوں سے زعفران زار بنا دیتے تھے۔ وہ کشمیری زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اُنہوں نے جو بھی شعروشاعری کی اُسے کہیں محفوظ نہیں رکھا اور نہ ہی چھپوایا۔ بس شوقیہ شاعری کیا کرتے تھے۔ شاید اُن ہی کے جینیز مجھ میں منتقل ہوگئے جو میں بھی اسی دشت خارزار کی سیاحی پر نکل پڑا۔ میری ماں دھان پان کی عورت تھی مگر وہ اپنے اندر اتنا دم خم رکھتی تھی کہ چار آدمیوں کا کام اکیلے کرتی تھی۔ وہ شہری ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ جب اُس کی شادی میرے والد سے ہوئی تو اُس نے گاؤں کے ماحول میں اپنے آپ کو اس طرح ڈھال دیا کہ جو بھی اُسے کام کرتے ہوئے دیکھتا تھا وہ عش عش کر اُٹھتا تھا۔ وہ کافی صفائی پسند تھی۔ طرح طرح کی ضیافتیں بنانے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

میں پیدا تو بڈگام میں ہوا مگر میری پرورش اوم پورہ میں ہوئی۔ میری بوا کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایک دن اُس کی ساس میرے والد کے پاس آگئی اور جھولی پھیلا کر اُس نے میرے والد صاحب سے مجھے مانگا۔ میں اُن کی تیسری اولاد تھا۔ میری دیدی اور میرا بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ ماں نہیں چاہتی تھی کہ میں اُس سے

الگ ہو جاؤں مگر اپنے سسر کے ڈر سے وہ کچھ بول نہیں پائی اور اس طرح چھ ماہ کا بچہ اپنے ماں باپ سے الگ ہو گیا۔

میرے گھر والوں نے میرا نام ہیرا لال رکھا تھا۔ میرے متبنی والد نے میرا نام دیا کشن رکھ دیا۔ وہ بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اُن کی ڈیوڑھی پر ہاتھی جھولا کرتے تھے۔ میرے اُس گھر میں منتقل ہونے کے بعد قبائلی حملہ ہوا اور وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر سری نگر بھاگ گئے۔ پھر ایک سال کے بعد وہ اپنے گاوں لوٹے۔ گھر تو خاک ہوا تھا۔ سارا پریوار بکھر گیا تھا۔ جائیدادیں بکنے لگیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے عرش سے فرش پر آ گئے۔ اُنہوں نے نئے سرے سے زندگی شروع کی۔ میں جو سونے کا چمچ منہ میں رکھ کے پیدا ہوا تھا، اب غربت اور تنگ دستی کے عالم میں پروان چڑھنے لگا۔

میرے لڑکپن اور عنفوان شباب کا دور اوم پورہ میں گزرا۔ میں اپنے گاوں کا لاڈلا تھا۔ گھر والے مجھے پیار سے بھائی جان کہہ کے بلاتے تھے۔ سارا گاؤں مجھے اسی نام سے بلاتا تھا۔ میری ابتدائی تعلیم یعنی پرائمری تک کی پڑھائی اوم پورہ کے اسکول میں ہوئی اور اُس کے بعد میٹرک تک کی پڑھائی میں نے بڈگام کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پوری کی۔ ہم صبح بہت سارے لڑکے اپنے اپنے بستے کاندھے پر لٹکائے اوم پورہ سے پیدل بڈگام پہنچ جایا کرتے تھے اور پھر شام کو کودتے پھاندتے گھر لوٹ آتے تھے۔ میرے دوستوں اور ہم جماعتوں میں سبھی مسلم لڑکے تھے۔ ہمارا کھانا پینا، ایک ساتھ ہوتا تھا۔ راستے میں کسی کے باغ سے پھل چرانا روز کا مشغلہ ہو گیا تھا۔ اُنہیں دنوں میں پڑھنے لکھنے کی طرف راغب ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا تو میں نے ایک اسٹیج ڈرامہ لکھا جس کا نام ''پنچایتی راج'' تھا۔ اُس وقت میری عمر محض سولہ سال تھی۔ ہم بہت سارے یار دوست جمع ہو گئے اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس ڈرامے کو پبلک کے

سامنے پیش کریں گے۔ مسئلہ یہ تھا کہ تھوڑا بہت سامان خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ جنون دیکھئے کہ ہم سب گھر گھر جا کر چندہ جمع کرنے لگے اور کچھ روپے جمع کر کے ہم تیاریوں میں جٹ گئے۔ میں اس پورے کھیل کا روحِ رواں تھا۔ اس کا ہدایت کار بھی میں ہی تھا اور مرکزی کردار بھی میں ہی نبھا رہا تھا۔ میرے جتنے بھی یار دوست تھے وہ اداکاری کرنے سے کترا رہے تھے۔ میں نے کم عمر ہونے کے باوجود اُن میں اعتماد پیدا کیا اور ہم شدومد کے ساتھ ڈرامے کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ ہم نے مل کر ایک مہینے میں یہ ڈرامہ تیار کیا۔ اوم پورہ میں ایک پنچایت گھر تھا۔ ہم نے اُس کو اپنا ریہرسل روم بنایا۔ یہیں پر ہم نے اسٹیج کھڑا کیا۔ اُن دنوں تفریح کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ایک ریڈیو سیٹ تھا جو اسی پنچایت میں لگا تھا جس پر ہم کبھی کبھار گانے وغیرہ سنتے تھے۔ جس دن ڈرامہ اسٹیج ہونے والا تھا، ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ لوگوں کا جم غفیر اس ڈراما کو دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑے گا۔ اس ڈرامے کے بعد میں گاؤں کا لاڈلا بن گیا۔ جہاں سے بھی گزرتا تھا لوگ مجھے میرے کردار کے مکالمے یاد دلاتے تھے۔

اس ڈرامے کی کامیابی کے بعد میں نے ایک اور ڈرامہ لکھا اور اسے سٹیج کیا۔ وہ بھی کامیاب رہا۔ میں کافی خوش گلو تھا۔ میں گلوکار محمد رفیع کی ہو بہو کاپی کر سکتا تھا۔ کتابوں کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ایک دن میں جب بڈ گام میں تھا تو امام باڑہ کے پاس ایک چھوٹا سا اسپتال ہوا کرتا تھا۔ اس کے ایک کمرے میں جس کی کھڑکیوں کے کانچ ٹوٹے ہوئے تھے، میں نے کتابوں کے بنڈل دیکھے۔ یہ کتابیں پنچایت گھر کی تھیں جو اُنہوں نے یہاں رکھوائی تھیں۔ کتابیں دیکھ کر میرا من للچا گیا۔ میں اپنے بڑے بھائی رتن لال کو ساتھ لے کر کئی کتابیں چرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس عمارت کے پاس ہی اوم پورہ کے ایک قصاب کی دکان تھی جس کا نام عزیز برہ تھا۔ اُس نے

ہمیں کتابیں نکالتے ہوئے دیکھا۔اُس نے میرے اصلی والد صاحب سے شکایت کی۔ ہم جب گھر پہنچے تو والد صاحب غصے سے بھرے ہوئے بیٹھے تھے۔سب سے پہلے بڑے بھائی صاحب کی پٹائی ہوئی۔والد صاحب کو غصہ بہت کم آتا تھا مگر اُس دن تو وہ غصے سے کھول رہے تھے۔میں چونکہ متبنی تھا اس لئے میں سستے میں چھوٹ گیا جب کہ اصلی خطاوار میں ہی تھا۔

میں نے ادبی سفر کی شروعات کشمیری شاعری اور ڈرامہ نویسی سے کی۔ اُردو میں لکھنے کی کوشش کی مگر میری اُردو اتنی کمزور تھی کہ جتنا بھی لکھتا تھا اُس میں اُردو الفاظ کم کم ہی دکھائی دیتے تھے۔میری خوش قسمتی یہ رہی کہ میرے اُردو ٹیچر آنجہانی برج پریمی تھے۔اُنہیں زبان پر جس طرح کی دسترس حاصل تھی، وہ دیکھ کر میں دنگ رہ جاتا تھا۔پتا نہیں اُنہیں مجھ میں کیا خوبی نظر آئی کہ وہ مجھ میں کافی دلچسپی لینے لگے۔وہ جب غالبؔ کی کوئی غزل پڑھ کر سناتے تھے اور پھر شعروں کی تشریح کرتے تو میں مسحور ہو کے رہ جاتا تھا۔شاید یہ اُن کی ہی صحبت کا اثر تھا جو میں اُردو میں بھی طبع آزمائی کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔اسی دوران چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔اُن دنوں میں بڈگام کے ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔میں نے کشمیری میں ایک نظم لکھی جو چین کی جارحیت کے خلاف تھی۔ہمارے ایک اُستاد محترم تھے جن کا نام جناب اکبر جے پوری تھا۔وہ بھی شاعری کیا کرتے تھے۔کسی نے اُن تک یہ بات پہنچائی کہ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔اُنہوں نے مجھے طلب کیا اور وہ نظم سنانے کو کہا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔بالآخر میں نے جیسے تیسے اُن کو یہ نظم سنائی۔اُسی ہفتے اسکول میں ایک تقریب منعقد ہونے والی تھا۔مجھے ماسٹر جی نے وہ نظم سنانے کو کہا۔ میں فطرتاً بڑا شرمیلا اور جسمانی لحاظ سے کافی کمزور تھا۔جب میرا نام پکارا گیا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔لشتم پشتم میں نے وہ نظم پڑھ لی۔مجھے نہیں معلوم اُس

کے بعد کیا ہوا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میری نظم پر خوب تالیاں بجیں۔ پرنسپل صاحب میری اس نظم کوسن کر کافی متاثر ہوئے تھے۔ ہمارے پرنسپل کا نام بشیر احمد خان تھا۔ میں بعد میں اُن کا چہیتا بن گیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے ایس۔ پی۔ کالج میں داخلہ لیا۔ پہلا سال پوار کیا۔ مجھے اُن دنوں کا ایک واقع یاد ہے۔ ہمارے سویکس کے پروفیسر ستیہ بھوشن جی تھے۔ یہ وہی پروفیسر تھے جو صدر ریاست مہارجہ کرن سنگھ جی کو ٹیوشن دیتے تھے۔ ایک دن کی بات ہے میں کرشن چندر کا ناول سکندر نیوز ایجنسی کے مجید سے مانگ کر لے آیا تھا اور اُس کو پڑھنے میں اس قدر مشغول تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ ستیہ بھوشن جی کب میری بینچ کے پاس پہنچ گئے۔ اُنہوں نے میرے ہاتھ سے ناول چھینا اور مجھے بینچ پر کھڑا کیا۔ مجھ سے پوچھا کہ میں کیا پڑھ رہا تھا۔ میرا سارا دھیان تو ناول پہ مرکوز تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کیا پڑھا رہے تھے۔ اُس دن کلاس میں میری بڑی سبکی ہوئی۔ ساری کلاس مجھ پر ہنسنے لگی۔

میرے ساتھیوں میں ایک ساتھی کا نام معراج الدین تھا جو بعد میں ایڈیشنل سیکرٹری کلچرل اکیڈمی بنا۔ ایک شبن سادھو تھا جو سوم ناتھ سادھو کا چھوٹا بھائی تھا اور بھی کئی دوسرے لڑکے تھے جو بعد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائض ہوئے۔ مرحوم لسہ کول مجھ سے ایک سال سنئیر تھا۔ وہ ہمیں این۔ سی۔ سی کی پریڈ کراتا تھا۔ میں نے فسٹ ائیر پاس کیا تھا۔ اب میں سیکنڈ ائیر میں جانے والا تھا۔ میں بڑی منت کر کے جب گھر سے فیس لے کے آیا تو کلاس کے ایک دو دوستوں نے مجھے یہ کہہ کر بہکا دیا کہ تم پرنسپل سے جا کر ملو وہ تمہاری فیس معاف کر دیں گے۔ میں اُن کے جھانسے میں آ گیا اور فیس کے پیسے دوستوں کے ساتھ اُڑا لئے۔ اُن دنوں عبدالعزیز ایس۔ پی۔ کالج کے پرنسپل تھے۔ میں جب اُن کے پاس فیس معاف کرانے کی درخواست لے گیا تو

اُنھوں نے میری فیس معاف کرنے سے انکار کر دیا۔اُن کے انکار سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں بڑی مشکل سے والد صاحب سے فیس مانگ کر لایا تھا۔اب میں اُن کو کیا جواب دیتا۔ چند دنوں تک میں یونہی گھر سے نکلتا اور شہر میں ادھر اُدھر ڈنڈے بجاتا پھرتا تھا۔ایک دن میں نے اپنے متبنٰی والد سے بڑی ہمت کر کے کہا کہ میں اب پڑھنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں کوئی نوکری کر کے اُن کا بوجھ کچھ کم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے متبنٰی والد صاحب نے کچھ نہیں کہا۔اُن کی خاموشی کا مطلب تھا کہ اُنہیں میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بھی اُن دنوں تنگ دستی کے دور سے گزر رہے تھے۔

میرے اصلی والد کانگریس پارٹی کے ساتھ آخری دم تک جڑے رہے۔ وہ سری نگر میں کانگریس کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔غلام رسول رینزو اُن کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ایک مرتبہ اُنھوں نے میری نوکری کے بارے میں اُن سے بات کی تو رینزو صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو میرے پاس بھیج دیں۔میں اگلے روز اُن سے ملنے اُن کے آفس پہنچا۔اُنھوں نے بڑے پیار سے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور پھر مجھ سے کہا کہ وہ مجھے پنچایت محکمے میں انسپکٹر بنا دیں گے۔کل آ کے آڈر لے جانا۔ میں یہ خبر سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔ میں خوشی کے اُڑن کھٹولے پر اُڑتا ہوا گھر چلا گیا۔ یہ صادق صاحب کا دور تھا۔اُن دنوں کچھ ایم۔ ایل۔اے اُن سے باغی ہو گئے تھے جن میں عبدالرحمان راحت بھی تھا۔ میں دوسرے دن جب آڈر لینے رینزو صاحب کے دفتر پہنچ گیا تو پتا چلا کہ وہ نوکری اُنہیں راحت صاحب کے بیٹے اشرف راحت کو دینی پڑی اور میں خالی ہاتھ لوٹ گیا۔ میں قسمت کے اس کھیل پر بس آہیں بھرتا رہ گیا۔

بہت دنوں تک میں یونہی جوتیاں چٹخاتا رہا۔کہیں کوئی آس دکھائی نہیں دے

رہی تھی۔ ماسٹری کی نوکری مل رہی تھی جو میں اپنی ناتوانی کی وجہ سے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب کہ میرے بیشتر دوست اُستاد بھرتی ہوئے تھے۔ شاید میرے نصیب میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ میرے بہنوئی چمن لال کول محکمہ ٹرانسپورٹ کے بشیر احمد ملک کو اچھی طرح جانتے تھے جو کہ یارڑ ماسٹر تھے۔ اُنہوں نے بشیر صاحب سے بات کی۔ وہ میرے جیجا سے بولے کہ کل اُسے میرے پاس بھیج دینا۔ والد صاحب دوسرے دن مجھے بشیر صاحب کے پاس لے گئے۔ اُن دنوں سپرو صاحب ٹریفک منیجر تھے اور جے۔ ایس۔ جموال ڈائرکٹر تھے۔ بشیر صاحب نے سپرو صاحب سے بات کی اور مجھے کنڈکٹر کم کلرک کی نوکری مل گئی۔

نوکری کے دوران میں ایک ناکام محبت میں مبتلا ہوا جس کی وجہ سے میرا دل بہت ٹوٹ گیا۔ اس ناکامی نے مجھے کہانیاں لکھنے کی طرف مائل کر دیا۔ میرا کہانی کار بننے میں میری پہلی محبوبہ کا ہاتھ رہا ہے۔ نہ دل میں عشق کی چنگاری پڑتی نہ میں اُردو میں لکھنے کی کوشش کرتا۔ ویسے بھی میں نے سیمابی طبیعت پائی ہے۔ ایک ہی چیز پر ٹکے نہیں رہ سکتا۔ کشمیری شاعری سے بہت جلد میرا من بھر گیا تھا اس لئے میں اُردو میں ایک بار پھر لکھنے کی سعی کرنے لگا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ آں جہانی برج پریمی میرے اُردو ٹیچر تھے۔ میں ان کا دیوانہ بن گیا تھا۔ اُن دنوں مجھے یہ فہم کہاں تھی کہ جس کی شاگردی میں، میں اُردو زبان سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں ایک دن اُن کا شمار اُردو ادب کے چنندہ ادیبوں ونقادوں میں ہوگا۔

میں نے اپنا قلمی نام ڈی۔ کے۔ کنول رکھ دیا تھا اور اسی نام سے بے سرو پیر کی کہانیاں لکھتا تھا۔ میرے منجھلے ماموں سورگیہ سومناتھ گنجو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ چونکہ وہ اپنے تینوں بھانجوں میں سے مجھے کچھ زیادہ ہی لاڈ کرتے تھے اس لئے میں اُن کو ہی اپنی یہ بے تکی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ وہ میرا دل رکھنے کے لئے یہ کوفت

چپ چاپ سہہ لیتے تھے اور میں اس غلط فہمی کا شکار ہوتا جا رہا تھا کہ میں بہت بڑا کہانی کار بن چکا ہوں۔

جس دن میری پہلی کہانی دلی کے اخبار ''تیج'' میں چھپی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں اخبار ہاتھ میں لے کر ہر ایک کو دکھاتا رہا۔ اس کے بعد دلی کے اخبار ''ملاپ'' میں میری کہانی چھپی۔ میری کہانیاں ''چترا'' دلی میں تواتر سے چھپنے لگیں۔ یاد رہے کہ ''چترا'' ایک ہفتہ وار فلمی میگزین تھا جو فلمی شائقین میں کافی مقبول تھا۔ ''تیج'' اور ''پرتاپ'' میں میری کہانیاں تواتر سے چھپتی رہیں۔ ان اخباروں نے میرا حوصلہ بڑھا دیا اور میں اپنی کہانیاں دیگر میگزینوں کو بھیجنے لگا۔ انہی دنوں سری نگر سے ایک رسالہ نکلا جس کا نام ''نگینہ'' تھا۔ اُس میں ملک کے نامی شاعر اور افسانہ نگار چھپنے لگے۔ اسی دوراں ''نگینہ'' نے ایک افسانہ نمبر نکالا جو اپنی مثال آپ تھا۔ اُس کے بعد کئی خاص نمبر نکلے جو لاجواب تھے۔ یہ رسالہ دس برس تک متواتر چھپتا رہا اور میں اُس میں ہمیشہ جگہ پاتا تھا۔ آج ''نگینہ انٹرنیشنل'' کے نام سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے بلکہ اس نے ملک کی سرحدیں بھی پھلانگ دی ہیں۔ آج کل ''نگینہ'' کو عالمی سطح پر ایک موقر رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

صادق صاحب کا دور تھا۔ جی۔ آر۔ عشائی نام کا ایک خوش رو نوجوان کی تقرری محکمہ ٹرانسپورٹ میں بطور پی۔ آر۔ او ہوئی تھی۔ یہ نوجوان بہت ہی شرمیلا تھا۔ اُن دنوں میرے باس محمد شفیع وڈیرہ تھے۔ وہ مذاقیہ طبیعت کے آدمی تھے۔ جب عشائی صاحب ان کو کوئی لطیفہ سناتے تو مارے شرم کے اُن کے گال لال ہو جاتے تھے۔ ایک بار کیا ہوا کہ جاڑے کا موسم تھا۔ میں آگے آگے چل رہا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے عشائی صاحب چل رہے تھے، مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ چونکہ سارے کلینر ڈرائیور مجھے جانتے تھے کیونکہ میں اُن کا باس تھا اس لیے جب میں چل رہا تھا تو جو بھی راستے میں مل جاتا

، وہ سلام ٹھونک دیتا تھا۔عشائی صاحب بڑے افسر تھے پھر بھی کوئی اُنہیں سلام نہیں کر رہا تھا۔اُن کی انا مجروح ہوئی۔وہ کچھ نہیں بولے چپ چاپ اپنے آفس میں چلے گئے۔ پر یہ بات اُن کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی رہی۔کچھ دن بعد عشائی صاحب کی ترقی ہوگئی اور وہ ڈپٹی ڈائریکٹر بن گئے۔اب وہ بڑے افسر اور اوپر سے نوجوان تھے۔ اُن پر صادق صاحب کا دست شفقت تھا کیونکہ اُن کا ایک قریبی رشتہ دار صادق صاحب کا دست راست تھا۔افسر بننے کے بعد وہ ایک دم بدل گئے۔جو انسان بات بات پر شرماتا تھا وہ اتنا جارح بن گیا کہ اب اُن کے چہرے سے افسری شان اور نخوت صاف جھلکتی تھی۔وہ اتنے مغرور ہو گئے کہ ڈرائیوروں کلینزوں پر ہاتھ بھی اُٹھا لیتے تھے۔

عشائی صاحب سے معاملات بگڑ گئے تو میرے خلاف دفتری کارروائی شروع ہوئی۔میں تنخواہ لینے جاتا تھا تو پتا چلتا کہ میری تنخواہ بند کی گئی۔جب تین چار مہینے گزر گئے اور میری طرف سے کوئی ایکشن نہیں ہوا تو ایک دن مجھے برطرفی کا آڈر ملا۔یعنی میں نوکری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برطرف ہوا تھا۔

اسی دوران میں نے پہلا ناولٹ ''کشمکش'' لکھا۔ میں اسے چھپوانے کے لئے لدھیانہ چلا گیا۔ وہاں سے ایک پرچہ ''پرواز'' نکلتا تھا۔جس میں میری کہانیاں چھپ چکی تھیں۔ وہ رسالہ بس نئے لوگوں کی الم غلم چیزیں چھاپتا رہتا تھا۔اصل میں ''پرواز'' والوں کا اپنا پریس تھا۔وہ نئے لوگوں کی چیزیں چھاپ لیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے میرا ناولٹ چھاپ لیا۔ناولٹ چھپوانے کے بعد میں سری نگر لوٹ آیا۔

میرے اصلی والد پنڈت لسہ کول اُن دنوں سری نگر کے کانگریس دفتر میں کام کرتے تھے۔اب یہ بات سب کو معلوم تھی کہ مجھے نوکری سے برطرف کیا گیا ہے۔ والد صاحب مجھے ہر مہینے سو روپے خرچے کے لئے دیتے تھے۔ایک دن اوم پورہ کے گھر میں ہمارے پنڈت جی آگئے۔میرے متبنی والد نے میری جنم پتری اُنہیں دکھائی۔

اُنہوں نے میری جنم پتری دیکھ کے کہا کہ اس وقت میرا برا وقت چل رہا ہے۔ پندرہ ستمبر کو اسے نوکری کا آڈر مل جائے گا۔ میں اسے دیوانے کی بڑ سمجھ بیٹھا۔ مجھے نوکری سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔ایسے میں پنڈت جی کا یہ کہنا کہ مجھے پندرہ ستمبر کو پھر سے نوکری کا آڈر مل جائے گا۔ بات یقین سے پرے تھی۔

ایک دن میں نے اپنے ناولٹ ''کشمکش'' کی ایک کاپی جموال صاحب کو بھیج دی۔ تین چار روز کے بعد مجھے ہیڈ آفس سے بلاوا آ گیا کہ میں عشائی صاحب سے آ کے ملوں۔ میں نے سوچا کہ یہ عشائی صاحب کی نئی چال ہوگی۔ وہ مجھے ہیڈ آفس میں بلا کر پہلے میری پٹائی کریں گے اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کریں گے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں ملنے ضرور جاوں گا۔ جب میں ٹرانسپورٹ کے ہیڈ کواٹر پہنچا تو عشائی صاحب کا چپراسی شکر قند کی طرح میٹھا تھا۔ جب اُس نے مجھے دیکھا تو وہ قدرے خوشی سے بولا۔ ارے آپ کتابیں بھی لکھتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔عشائی صاحب کا بلاوا آ گیا ہے۔کہیں وہ مجھے پیٹیں گے تو نہیں۔ وہ بولا ، ارے کیسی بات کرتے ہیں۔ اتنے میں اُن کے کمرے سے ٹھگنے قد کا ایک نوجوان نکلا۔ اُس نے مجھے دیکھ کے انگریزی میں کچھ تعجب اور کچھ مسرت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔اوتو آپ ہیں مسٹر کنول۔ یہ کہہ کر وہ جموال صاحب کے کمرے میں گھس گئے۔ میں بھی ہمت کر کے عشائی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ جوں ہی میں نے اُنہیں سلام کیا وہ اپنی کرسی سے فوراً کھڑے ہوئے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملا کر بیٹھنے کے لئے بولے۔ میں اُن کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُنہوں نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔ ان غلطیوں کو معاف کرنا چاہیے۔اُس کے بعد اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ اُنہوں نے پوچھا، پھر سے ہمارے ساتھ کام کرو گے۔ میں نے کہا

کیوں نہیں۔ اُنہوں نے کہا فی الحال آپ کو ڈیلی ویجر کے حساب سے رکھیں گے۔ بعد میں آپ کو مستقل کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ میں ڈیلی ویجر کے حساب سے کام نہیں کروں گا۔ مجھے میرا پوسٹ واپس چاہیئے۔ وہ بولے ابھی ممکن نہیں ہے۔ مجھے تھوڑا وقت دیجیئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے صاحب۔ اس کے بعد مجھے دوسرے ڈپٹی ڈائرکٹر عبدالغنی بٹ نے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ بھی بڑے تپاک سے ملے۔ اُنہوں نے بھی یہی پیشکش کی۔ میں نے اُن کی پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ میں فی الحال حمید صاحب کے ساتھ کام کروں جو سپر نٹنڈنٹ تھے۔ یہ وہی ٹھگنے سے نوجوان تھے جو مجھے عشائی صاحب کے کمرے کے باہر ملے تھے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ اگست کا مہینہ تھا۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ ہوا یہ تھا کہ جب میں نے جموال صاحب کو اپنا پہلا ناولٹ بھیجا تو اُنہوں نے عشائی صاحب سے پوچھا کہ یہ نوجوان کون ہے۔ تو عشائی صاحب نے کہا کہ یہ اس محکمے میں کام کرتا تھا۔ اسے ایک سال پہلے نوکری سے برطرف کیا گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت ڈی۔ پی۔ در صاحب کے پی۔ اے بھی کمرے میں بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے جب کتاب کھول کے دیکھی تو اُنہوں نے انگریزی میں جموال صاحب سے کہا کہ آپ کے محکمے میں ایسے ہیرے بھی موجود ہیں۔ جب عشائی صاحب سے اُنہوں نے میری برطرفی کی بات سنی تو وہ عشائی صاحب سے کافی خفا ہوئے۔ اُنہوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے عشائی صاحب سے کہا کہ ایسے باصلاحیت نوجوان کو آپ نے باہر کر دیا۔ اسے واپس بلا لیجیئے۔ بس یہاں سے میری تقدیر بدل گئی۔

میں روز آفس آتا تھا۔ حمید صاحب مجھے اپنے سامنے بٹھا دیتے تھے۔ دھیرے دھیرے اُنہیں مجھ سے لگاؤ ہو گیا۔ حمید صاحب خود بھی ادبی ذوق شوق رکھتے تھے، اس

لئے وہ میری قدر کرنے لگے۔ میں روز عشائی صاحب کو یاد دلاتا تھا۔ وہ مجھے تسلی دیتے رہتے تھے۔ میں اپنا صبر کھوتا جا رہا تھا۔ حمید صاحب میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے۔ محمد عبداللہ بارسو ہیڈ کلرک تھے اور عشائی صاحب کے بہت قریبی تھے۔ چودہ ستمبر کی رات کو وہ حمید صاحب اور عشائی صاحب آفس میں ہی بیٹھے رہے اور اُنہوں نے میری بحالی کا راستہ کھوجا۔ سویرے جب میں آفس آیا تو میرے ٹیبل پر آڈر کاپی آ گئی۔ مجھے برطرفی کے دن سے ہی بحال کیا گیا تھا۔ مجھ پر افسر سے بدتمیزی کرنے پر سو روپے کا جرمانہ عائد کیا گیا تھا۔ یہ پندرہ ستمبر کی تاریخ تھی۔ پنڈت جی کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھی۔ مجھے ایک سال کی تنخواہ کے ساتھ کھوئی ہوئی نوکری بھی مل گئی۔ یہ تھا اُس ناولٹ کا کمال۔

میں اردو جریدوں میں چھپ تو رہا تھا مگر ریڈیو تک میری رسائی نہیں ہو پا رہی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں یارڑ میں کام کرتا تھا۔ عبدالخالق ہمارے یارڑ ماسٹر تھے۔ وہ ریڈیو کشمیر کے موہن لال ایمہ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اُنہوں نے ایک دن اُن سے بات کی اور مجھے اُن سے ملنے کے لئے کہا۔ میں ایمہ صاحب سے ملا۔ اُنہوں نے مجھے مرحوم اختر محی الدین کے پاس بھیج دیا۔ میں پہلی بار اختر صاحب سے ملا۔ وہ بڑے پیار سے ملے اور اُنہوں نے مجھے کچھ کارآمد باتیں بتائیں۔

میری مراد پوری نہیں ہوئی۔ ریڈیو میرے لئے ایک سراب بنا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس کے سہارے ریڈیو کشمیر سری نگر تک پہنچا۔ اُن دنوں ریڈیو کشمیر میں کشمیر کے جانے مانے ادیب اور فن کار کام کرتے تھے جن میں بنسی نردوش، سوم ناتھ سادھو، اوتار کشن رہبر، اُمیش کول، کمال احمد صدیقی، قیصر قلندر، فاروق نازکی وغیرہ جیسے نام قابل ذکر تھے۔ یہ سب ریڈیو کشمیر کے اہم ستون تھے۔ یہ سب جید تھے اور اُن کو متاثر کرنا آسان نہ تھا۔ جناب کمال احمد صدیقی اُن دنوں ریڈیو کشمیر سری نگر میں

یوتھ پروگرام کے انچارج تھے۔کمال صاحب خوداُردو کے بلند پایہ شاعراور براڈ کاسٹر تھے۔اُن ہی دنوں بشیر شاہ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہوگئے تھے۔بشیر شاہ سے پہلے رسمی علیک سلیک ہوتی تھی۔کچھ دنوں کے بعد پتا چلا کہ یہ وادی کے مشہور افسانہ نگار نور شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔وہ کمال احمد صدیقی کے ماتحت کام کرتے تھے۔وہاں پر ایک اسسٹنٹ تھا جس کا نام میرک شاہ تھا۔میرک شاہ چونکہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا اس لئے میری اُس کے ساتھ بہت جلدی دوستی ہوگئی۔وہ بڑا ہی زندہ دل اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ہر وقت لطیفہ گوئی میں مصروف ہوتا تھا کہ سننے والا بے ساختہ ہنس پڑتا تھا۔شاید اُسی نے میری پہچان بشیر شاہ سے کروائی۔پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ہمارا رشتہ آپ سے تم تک پہنچ گیا۔بشیر شاہ دل کا راجہ تھا۔ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔اُس کے ساتھ میرا ایسا رشتہ بنا جو خون کے رشتے سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔وہ بھی یوتھ پروگرام میں اسسٹنٹ کے طور کام کررہا تھا۔بشیر کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ مجھے مہینے میں کم سے کم دو تین پروگرام مل جایا کریں۔مجھے یاد ہے کہ ایک دن بشیر شاہ میری ایک کہانی ریکارڈ کرنے والا تھا۔اُن دنوں اُردو پروگرام مرحوم سوم ناتھ سادھو دیکھا کرتے تھے۔کہانی ایک ایسے نوجوان کی تھی جس کا باپ دمے کا مریض ہے جو رات بھر کھانستا رہتا ہے۔اُس کی کھانسی کی وجہ سے بیٹے کی نیند میں خلل پڑ جاتا ہے۔ایک دن وہ آپا کھو بیٹھتا ہے اور باپ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا ہے۔جب وہ باپ کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے تو دیکھتا ہے اُس کی سانسیں بند ہو چکی ہیں۔بیٹا باپ کے قدموں میں گر کر پھوٹ پھوٹ کے روتا ہے۔سادھو صاحب نے کہا یہ کہانی ریڈیو کی پالیسی کے منافی ہے۔بشیر شاہ سادھو صاحب سے بحث کرنے لگا۔اُس کا کہنا تھا کہ یہ ایک بہترین کہانی ہے ہمیں اسے نشر کرنا چاہیے۔سادھو صاحب نے پشکر بھان سے رائے مانگی۔اُس نے بھی سادھو صاحب کے خیال کی تائید کی۔بشیر بڑا رنجیدہ ہوا۔بہر حال

مجھ سے وہیں پر بیٹھ کر دوسری کہانی لکھوائی گئی جسے ریکارڈ کیا گیا۔ بشیر کو ہمیشہ اس بات کا ملال رہا کہ ایسی بہترین کہانی وہ ریکارڈ نہ کر سکا۔ ایسا تھا میرا دوست بشیر شاہ۔

کمال صاحب پرڈیوسر تھے۔ بشیر شاہ نے ہی مجھے اُن سے متعارف کرایا۔ بعد میں کمال صاحب سے بڑی انسیت بڑھ گئی۔ مجھ کو سنوارنے اور نکھارنے میں کمال صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگر آج میں دو چار جملے ڈھنگ کے لکھ پاتا ہوں تو یہ اُن ہی کی دین ہے۔ اُن کی شاگردی میں رہ کر میں نے نہ صرف زبان کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ میرا بگڑا تلفظ بھی کسی حد تک سدھر گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب کبھی فاروق نازکی صاحب میری کوئی کہانی ریکارڈ کرتے تھے تو وہ اپنا سر پیٹتے۔ اپنے بال نوچنے لگتے تھے۔ وہ مجھ سے بار بار آل انڈیا اُردو سروس سننے کی تلقین کرتے تھے۔ فاروق صاحب نے جو مجھے اُردو سروس کی طرف مائل کر دیا تو میں پھر اس سروس کا ایسا دیوانہ ہو گیا کہ روزِ ہجرت تک میں اسے سنے بنا رہ نہیں پاتا تھا۔ ہائے کیا اناونسر تھے۔ اُن کے منہ سے جیسے الفاظ نہیں پھول جھڑتے تھے۔ کیا فصیح اُردو بولا کرتے تھے۔

ٹرانسپورٹ میں بہت سارے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ میں ایک رائٹر بھی ہوں۔ اپنا رعب جمانے کے لئے جس دن میرا ریڈیو سے کوئی پروگرام ہوتا تھا تو میں اپنے سبھی یار دوستوں کو سننے کی تلقین کیا کرتا تھا۔ اس محکمے میں میرا کام کلینزوں کی حاضری لگانا ہوتا تھا۔ ان کلینزوں میں ایک بزرگ کلینز محترم رزاق صوفی تھا۔ ایک دن وہ بیمار ہو گیا تو اُس کا بیٹا اُس کی چھٹی کی درخواست لے کر آیا۔ اُس نے جب اپنا تعارف پیش کیا تو میں چونک پڑا۔ اس کا نام شبنم قیوم تھا جو کشمیر کے ادبی ماحول میں ایک جانا پہچانا نام تھا۔ شبنم قیوم سے ملنے کے بعد ہم بہت جلد دوست بن گئے۔ دوست بھی ایسے جیسے ایک جان دو قالب۔ میرے ادبی سفر میں مجھے ایک سچا رہبر مل گیا جو میری اُنگلی پکڑ کر مجھے ساتھ لے کے چلا۔ وہ نہ صرف میری الم غلم چیزوں کو ٹھیک

کرنے میں لگ گیا بلکہ اُس نے مجھے اچھے اچھے رسالوں میں چھپنے کے گر بھی سکھائے۔ پہلی مرتبہ میری چیزیں باہر کے معتبر رسالوں میں چھپنے لگیں جن میں میرے لئے سب سے اہم بمبئی سے نکلنے والا رسالہ ''شاعر'' تھا جس کے مدیر مرحوم اعجاز صدیقی تھے اور جس کے نثری حصے کو کرشن چندر کے برادار اصغر مہندر ناتھ جی دیکھا کرتے تھے۔ اُنہوں نے میری کافی حوصلہ افزائی کی۔ اس بیچ میرے دو اور ناول چھپ چکے تھے۔ یہ ناول تھے۔ ''تماشہ'' اور ''ترنگ''۔ کہانی کی بنت کاری۔ بیانیہ، پلاٹ بندی، کردار نگاری، ان سب باتوں سے میں بے بہرہ تھا۔ میں تو قلم اُٹھاتا تھا اور پہلگام جا کر ناول لکھ آتا تھا۔ ناول چھپ جاتا تھا تو اپنے یار دوستوں میں یہ ناول بانٹتا تھا۔ صحیح معنوں میں میرا ناولٹ ''نیا سفر'' ادبی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے۔ اس کا پیش لفظ جناب کمال احمد صدیقی نے لکھا تھا جس کی کسی حد تک پزیرائی ہوئی تھی۔

شبنم قیوم نے میری ملاقات سکندر نیوز ایجنسی کے مجید سے کرائی۔ مجید سکندر بک اسٹال پر بیٹھا کرتا تھا۔ وہ سکندر کا بھتیجا تھا۔ سکندر خود اخبار بانٹنے میں مصروف رہتا تھا اور بک اسٹال مجید چلاتا تھا۔ مجید گورا چٹا تھا۔ میں نے اُسے بہت کم ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ جب اُس کے پاس کوئی نیا ناول آجاتا تھا تو میں اُس سے پڑھنے کے لئے مانگتا تھا۔ پہلے تو وہ ڈانٹ دیتا تھا پھر تھوڑی دیر کے بعد نرم پڑ جاتا تھا اور کتاب یہ کہہ کر دیتا تھا کہ میں کل اُسے کتاب لوٹا دوں۔ میرے ادیب بننے میں مجید کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ اگر مجھے مفت میں کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں دیتا تو میں کہانی لکھنے کا فن نہیں سیکھ پاتا۔ مطالعہ ایک ادیب کے لئے بیحد ضروری ہے۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں کتابیں خرید کے پڑھ لیتا۔ بہت سارے ادیب شام کو سکندر نیوز ایجنسی کے پاس جمع ہوتے تھے۔ ان میں ایک اہم نام عمر مجید کا تھا۔ ہم آپس میں تبادلہ خیالات کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ

ہمیں کس رسالے میں اپنی کہانی بھیجنی چاہیے۔اس طرح کا خلوص آج کل بہت کم دکھائی دے رہا ہے۔

یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ غیر سرکاری رسالے کسی بھی ادیب کو معاوضہ نہیں دیتے ہیں ۔مجھے سب سے زیادہ خوشی اُس دن ملی جب ''شمع'' کے ادارے سے مجھے اٹھارہ روپے کا ایک منی آڈر ملا۔یہ میری اُس کہانی کا معاوضہ تھا جو کھلونا میں چھپی تھی۔اُس کے بعد میری کئی کہانیاں ''بانو'' میں بھی چھپی ۔معاوضہ وہی اٹھارہ روپے تھا۔میں جتنی بار کھلونا میں چھپا ہر کہانی پر مجھے معاوضہ ملا۔اس کے سوا کسی اور رسالے سے مجھے معاوضہ نہیں ملا۔سرکاری اداروں سے جتنے بھی رسالے نکلتے ہیں وہ تو معاوضہ دیتے ہیں مگر غیر سرکاری رسالوں میں ادارہ ''شمع'' کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

میں ایک بسیار نویس قلم کار بن چکا تھا۔میں کہانیاں لکھتا تھا۔بچوں کے لئے کہانیاں اور جھلکیاں لکھتا تھا۔گیتوں بھری کہانیاں لکھتا تھا جو''وادی کی آواز'' پروگرام میں نشر ہوتی تھیں اور کافی پسند کی جاتی تھیں ۔اس کے علاوہ میں ریڈیو مباحثوں میں حصہ لیتا تھا۔اسی بیچ ایک اور ادبی دوست بشارت احمد کی بھی ریڈیو کشمیر میں تقرری ہوئی۔میرے لئے تو ہر طرف چاندی ہی چاندی تھی۔سب کچھ من موافق چل رہا تھا مگر ایک کسک تھی کہ میں سب پروگرام کر رہا ہوں مگر میرا کوئی فل سکیپ ڈرامہ نشر نہیں ہو رہا ہے۔ ڈرامہ سیکشن کے انچارج جناب پران کشور تھے۔اُن کو قائل کرنا کارِ دارد والا معاملہ تھا۔میں نے کتنے ہی مسودے اُن کے حضور پیش کئے تھے۔چند دنوں کے بعد ایک ہی جواب ملتا تھا، بات بنی نہیں ۔اُن کی اس بے رخی سے میں بڑا دل برداشتہ ہوا جا رہا تھا۔میں نے اُن کو ایک جھلکی دی تھی ۔وہی رٹا رٹایا جملہ تھا کہ بات بنی نہیں ۔میں نے مسودہ واپس مانگا تو اُنہوں نے کہا کہ وہ ڈھونڈ کے واپس کر دیں گے۔ میں نے یہ بات جب کمال صاحب کو سنائی تو اُنہوں نے کہا کہ میں جا کر اسٹیشن ڈائرکٹر

سے مل لوں۔اُن دنوں ایس۔کے۔مینی اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔بشیر شاہ ڈرامہ سیکشن میں چلا گیا تھا۔میں نے اُس سے اُس کی رائے پوچھی تو اُس نے یہ مشورہ دیا کہ میں مینی صاحب سے نہ ملوں ۔ مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ شکایت کرنے پر تمہارا ایک آدھ ڈرامہ ضرور نشر ہوگا پھر مینی صاحب کتنے سال یہاں رہیں گے۔اس کے بعد اسی آدمی کے ساتھ تمہارا واسطہ رہے گا۔میں نے اُس کی بات مان لی اور شکایت نہیں کی۔ایک دن شبنم قیوم نے میری مشکل آسان کر دی۔اُس نے میرے ایک اسکرپٹ کو نئے سرے سے لکھا اور کچھ دنوں کے بعد مجھے یہ خوشخبری ملی کہ میرا ڈرامہ بہت جلد نشر ہونے والا ہے۔اُس کے بعد میں نے کئی ڈرامے لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔

اخبار ’’جہانِ نو‘‘ سے منسلک ہونے کے دوران مجھے فلمی سیکشن کا انچارج بنا دیا گیا۔پہلی بار کشمیر میں ایک ہفتہ وار اخبار کا فلمی سیکشن کلر میں چھپا۔پرچہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔میں دو سال تک اس اخبار کے ساتھ منسلک رہا۔میرا ایک ادبی دوست تھا جس کا نام یوسف جمال تھا جو کٹک (اُڑیسہ) کا رہنے والا تھا۔وہ پیر غیاث دین کے اخبار ’’چنار‘‘ کا مدیر تھا۔وہ مجھے اس اخبار میں لے آیا اور مجھے ادبی سیکشن کا انچارج بنا دیا۔یہاں بھی میں ایک آدھ سال کام کرتا رہا۔

میں نے دلی جا کر تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے بلاک بنوا لئے تھے۔اُن دنوں تصویریں بلاک کی مدد سے ہی چھاپی جاتی تھیں۔میرا ارادہ سری نگر سے ایک فلمی پرچہ نکالنے کا تھا۔پیسوں کی قلت کی وجہ سے یہ بیل منڈھے چڑھ نہیں پائی۔

ایمرجینسی کے دنوں میں ریڈیو کشمیر سری نگر کے ڈرامہ سیکشن نے مجھ سے ایک جھلکی لکھوائی جس کا نام ’’کالا بھوت‘‘ تھا۔سب سے پہلے اسے سری نگر اسٹیشن سے نشر کیا گیا۔بعد میں اسے وودھ بھارتی سے چلایا گیا۔یہ جھلکی اتنی کامیاب ہوئی کہ اُس کے بعد ہندوستان کے سبھی مقامی اسٹیشنوں سے اس کو وہاں کی زبان میں ڈب کر کے

نشر کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا ایک ڈرامہ ''پھر اُسی منزل کی تلاش'' ریڈیو کشمیر سری نگر سے نشر ہوا۔ سال 1976 تھا۔ یہ ایک تکونی پریم کہانی تھی جس میں منوہر پروتھی نے شوہر کا کردار ادا کیا تھا جب کہ پیارے لال رازدان نے عاشق کا کردار ادا کیا تھا۔ شاید اُما کھوسلہ بیوی کے کردار میں تھی۔ اس کردار کا نام نیلو تھا۔ یہ ہندو سماج کے پس منظر کی کہانی تھی جس میں شوہر کو ایک دن پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیوی کا ایک عاشق تھا۔ وہ اس عاشق کے لئے اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ تب عورت بولتی ہے کہ میں کوئی کھلونا ہوں کیا کہ چند دن آپ نے اس کھلونے کے ساتھ کھیلا۔ دل بہل گیا تو اس کھلونے کو کسی اور کو پیش کیا۔ یہی اسکرپٹ جالندھر دوردرشن سے بھی ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اچلا ناگر آل انڈیا ریڈیو دلی میں کام کرتی تھی۔ اُس نے من وعن اس کہانی کو اُٹھا کر بی۔ آر۔ چوپڑہ کو بیچ دیا اور نام رکھا ''نکاح''۔ ہندو بیک گراونڈ کی جگہ مسلم بیک گراونڈ کر دیا گیا۔ لڑکی کا نام وہاں بھی نیلو ہی تھا۔ اس طرح کے کئی مذاق مجھ سے ہوئے ہیں۔ ایک ٹیلی فلم بنائی جس کا نام ''مٹھی بھر آزادی'' تھی۔ اس کا کیسٹ کئی فلمی دفتروں میں گھومتا رہا۔ راکیش روشن نے اسی اسکرپٹ کو بنیاد بنا کر فلم ''خود غرض'' بنائی جو خوب چلی۔

1972 میں سری نگر دوردرشن کا آغاز ہوا۔ ہر ادیب دوردرشن کے چھوٹے سے پردے پر اپنے قلم کے جوہر دکھانا چاہتا تھا۔ میں بھی ایک دن اُردو ڈرامہ لے کر چمن لال ہکو کے پاس گیا جو دوردرشن سری نگر میں ڈرامہ پرڈیوسر تھے۔ اُنہوں نے میرا اسکرپٹ پڑھا۔ اُنہیں یہ ڈرامہ اچھا لگا۔ بعد میں کچھ لوگوں کی ایما پر اسے ٹیلی کاسٹ نہیں کیا گیا۔ چونکہ جے کشن زتشی مجھے جانتے تھے اور میرے کئی ڈرامے پیش کر چکے تھے۔ اُنہوں نے میرا پہلا ڈراما ٹیلی کاسٹ کیا۔ اس بار میرے رقیب بس ہاتھ ملتے رہ گئے۔ زتشی صاحب پروڈکشن کے معاملے میں بلا کی مہارت رکھتے تھے۔ اُنہی

کی ہدایت کاری میں میرا ایک کشمیری ڈرامہ ''دید'' ٹیلی کاسٹ ہوا جو اتنا مقبول ہوا کہ ناظرین اُس ڈرامے کو دیکھنے کے لئے بار بار فرمائش کیا کرتے تھے۔

ریڈیو اور ٹی وی کی بدولت لوگ اب مجھے جاننے لگے تھے۔ سانگ اینڈ ڈرامہ ڈیویژن میں میاں مجیب کام کرتے تھے۔ وہ کمال کے فن کار تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے ایک سکٹ لکھوایا جس کا نام ''لال تکون'' تھا۔ یہ سکٹ فیملی پلاننگ پر مبنی تھا۔ میں نے کبھی یہ اندازہ نہیں لگایا تھا کہ یہ سکٹ اتنا مقبول ہو جائے گا۔ اُس سکٹ کے سو کے قریب شوز ہوئے۔ یہاں تک کہ بنگلہ دیش میں بھی اسے اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے کے لئے مجھے ایوارڈ بھی ملا۔ کچھ سال بعد اسے ٹیلی کاسٹ بھی کیا گیا۔

شبنم قیوم اور میرا ساتھ صرف کہانیوں تک محدود نہیں رہا۔ ہم نے مل کر ایک رسالہ بھی نکالا جس کا نام ''کینواس'' تھا۔ ہم دونوں سرکاری ملازم تھے۔ تنخواہ اتنی زیادہ نہ تھی کہ گھر کے اخراجات بھول کر اپنے ادبی شوق پورے کرتے۔ یہ جنون ہی تھا کہ ہم گھر والوں کو تو پیسے کے لئے ترساتے تھے جب کہ اپنی محنت کی کمائی ادبی رسالے میں جھونک رہے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس رسالے کے تین شمارے نکالے۔ اُن دنوں یہ پہلا رسالہ تھا جس کا سرورق بہت ہی خوبصورت اور رنگین ہوتا تھا۔ تین شماروں کے بعد ہم ایک دم کنگال ہو کے رہ گئے۔ اُس کے بعد ہم نے اس شوق کو پھر کبھی نہیں پالا۔

صادق صاحب جن دنوں وزیر اعلیٰ تھے، ہمیں معلوم ہوا کہ اُنہوں نے کئی سرکردہ ادیبوں کو کشمیر آنے کی دعوت دی ہے جن میں سجاد ظہیر، اُن کی بیگم رضیہ سجاد ظہیر اور مخدوم محی الدین تھے۔ یہ سب لوگ صادق صاحب کے ذاتی مہمان تھے اور وزیر اعلیٰ کی کوٹھی میں ہی اُن کا قیام تھا۔ میں اور شبنم قیوم اُن سے جا کے ملے۔ رضیہ آپا تو اتنی مہربان رہی کہ وہ ایک گھنٹے تک ہمارے ساتھ بیٹھی رہیں اور ہم سے ادبی مباحث

پر گفتگو کرتی رہیں۔ یہ سب عظیم فن کار ہی نہیں عظیم انسان بھی تھے۔اسی طرح ہم کرشن چندر سے بھی سری نگر میں ملے۔وہ سرکٹ ہاوس میں اپنی بیگم سلمہ صدیقی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔

کشمیر میں وی۔ایچ۔ایس کیمرہ آچکا تھا۔میرے ایک دوست سلیم شہزاد نے یہ کیمرہ خریدا تھا۔میں اُن دنوں بمبئی میں تھا۔ایک دن اُس کا ایک خط ملا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ اُس نے کیمرہ گھر میں رکھنے کے لئے نہیں خریدا ہے۔جلدی سے آجاؤ اور اس سے کچھ کام کرو۔میں سری نگر چلا آیا تو میں نے پہلی بار اس کیمرہ سے ایک ٹیلی فلم بنائی جس کا نام تھا ''جھیل بلاتی ہے''۔اس کی کہانی شبنم قیوم کی تھی جب کہ سکرین پلے اور ڈائیلاگ میں نے لکھے تھے۔اس میں ضمیر عشائی، ونے رینہ اور نونیت کور مرکزی کردار میں تھے۔جب فلم بن کر تیار ہوگئی تو ہم نے اس کا ایک شو رکھا۔شبنم قیوم بھی مہمانوں میں شامل تھا۔جب اُس نے فلم دیکھی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو کے چلا گیا۔اگلے روز میں اس کے گھر گیا تو وہ کافی ناراض تھا۔میں نے ناراضگی کا سبب پوچھا تو کہنے لگا کہ تو نے میری کہانی کی ایسی تیسی کر دی ہے۔میں نے کہا کہ جب کہانی کا اسکرین پلے بنتا ہے تو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔وہ شاید اسکرین پلے کے لوازمات سے بے بہرہ تھا اس لئے وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔اگلی بار میں نے جو دوسری ٹیلی فلم بنائی تو اس کی کہانی میری تھی اور اسکرین پلے اور ڈائیلاگ بھی میرے تھے۔اس ٹیلی فلم کا نام ''مٹھی بھر آزادی'' تھا۔اس میں بھی ضمیر عشائی اور نونیت کور مکھیہ کردار میں تھے۔اس فلم کی خوب سراہنا ہوئی۔ہم نے جب یہ فلم اُس وقت کے چیف منسٹر فاروق عبداللہ کو دکھائی تو وہ اس فلم سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ وہ یہ تمام جنگلات کے عملے کو دکھائیں۔اس ٹیلی فلم کے پلاٹ کو بعد میں راکیش روشن نے اٹھا لیا جو ایک ایکٹر اور کامیاب پرڈیوسر ہے۔فلم کا نام ''خود

غرض'' رکھا جو بے حد کامیاب رہی۔

کرمن بمبئی کا ایک پارسی نوجوان تھا جو اُس لاج کے بغل میں رہتا تھا جہاں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ایک دن ہوٹل کے منیجر پرکاش نے میری کرمن سے ملاقات کرائی۔ وہ بہت جلد میرا دوست بن گیا۔دوست بھی ایسا کہ وہ مجھ پر جان چھڑکنے لگا۔اُس نے مجھے بمبئی میں کئی پرڈیوسروں سے ملایا۔اُن میں سے ایک سریندر مہاجن تھا جو اپنی پہلی فلم ''خون کی ٹکر'' کی تکمیل میں مصروف تھے۔اُنہوں نے مجھے اپنی اگلی فلم کے لئے بطور رائٹر سائن کیا تھا۔بدقسمتی سے سریندر مہاجن کو اُس کے پارٹنر نے ٹھگا اور وہ فلمسازی چھوڑ کے اسٹیٹ ایجنٹ بن گیا اور میری اُمیدوں پر پانی پھیر گیا۔اس بات کا سریندر مہاجن کو اب تک ملال ہے کہ وہ میرے لئے کچھ نہ کر سکا۔

کرمن کا جو ماما تھا اُسکا نام جمی جال کوپر تھا۔اُس کی بیوی بمبئی کے ایک بینک میں اچھے عہدے پر فائز تھی۔اُن کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام پنکی تھا۔ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک جیپ میں بیٹھ کر گھر کی طرف آرہی تھی کہ جیپ کو حادثہ پیش آیا۔ چار لوگوں میں سے ایک پنکی ہی تھی جو اس حادثے میں ماری گئی۔ ماما پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔چند مہینوں بعد کرمن نے ماما کو اس بات کے لئے راضی کر لیا کہ وہ پنکی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ایک فلم بنالے۔ہندی فلم بنانا اُن کے بل بوتے کی بات نہیں تھی۔فیصلہ یہ ہوا کہ کشمیری میں فلم بنائی جائے۔ماما راضی ہوا۔ہم نے فلم کی تیاریاں شروع کیں۔یہ 1989 کا سال تھا۔سارے لوازمات پورے کرکے میں اسٹاک لے کے فلائٹ سے کشمیر کے لئے نکل گیا اور ماما اور کرمن کو یونٹ کے ساتھ آنے کے لئے کہا۔میں نے کشمیر پہنچ کر ستاروں کا انتخاب کیا۔لوکیشن فائنل کی۔ اسکرپٹ کو آخری شکل دی اور ڈائیلاگ کو اُردو سے کشمیری میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری برج ناتھ بے تابؔ کو سونپی۔فلم کا نام ''انقلاب'' رکھا۔یہ ''مٹھی بھر آزادی'' کا

کشمیری روپ تھا۔فلم میں کشمیر کے بیشتر اداکار کام کر رہے تھے۔اس فلم کا مہورت ایم۔ایل۔اے ہوسٹل میں ہوا۔کلیپ اُس وقت کے ڈویژنل کمشنر محمد شفیع پنڈت نے دیا اور کیمرہ فاروق عبداللہ نے آن کیا۔اُس کے بعد ہم نے دو دن سری نگر میں شوٹنگ کی اور سولہ دن پہلگام کے آڑو میں شوٹنگ کی۔کشمیر میں حالات بگڑنے لگے تھے۔

ایک آدھ مہینے کے بعد میں بھی بمبئی کے لئے روانہ ہوا۔ میں نے چند کپڑے اپنے ساتھ لئے۔اس ارادے سے کہ جتنا کام کیا ہے پہلے اس کی ایڈیٹنگ کرلوں اور بعد میں جاڑے میں بچوں کو بمبئی لے کے آجاوں گا۔بمبئی میں ہم نے ایڈیٹنگ کی۔جتنا بھی کام ہوا تھا وہ قابل تعریف تھا۔اُن ہی دنوں ضمیر بھی بمبئی آگیا۔ اُس نے ایک ڈاکومینٹری بنائی تھی جس کی ایڈیٹنگ کے لئے وہ آیا تھا۔میں اُن دنوں چودھری کے ساتھ رہ رہا تھا۔میں ضمیر کو بھی وہیں لے آیا۔چونکہ چودھری کے پاس انٹاپ ہل میں سرکاری فلیٹ تھا۔ہمارا وقت بڑا اچھا گزرتا تھا۔کشمیر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔وہاں کی تصویریں دیکھ کر دل دہل جاتا تھا۔ضمیر نے اپنا کام پورا کیا۔جاتے جاتے وہ مجھ سے دو لیٹر لے گیا۔بات یہ تھی کہ میں نے اُسے ایک ٹیلی فلم لکھ کے دی تھی جس کا نام ''چشم دید گواہ'' تھا۔اُن دنوں مسٹر ہیمبریم دور درشن سری نگر کا اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔جب ضمیر نے اُنہیں اسکرپٹ دی تو اُنہوں نے ضمیر سے کہا کہ وہ یہ اسکرپٹ کے لئے دہلی سے اپرول لائے گا۔چند دنوں میں اس ٹیلی فلم کا اپرول آگیا اور فلم ٹیلی کاسٹ ہوگئی۔

1989 میں میرا ایک اور ناول ''دردانہ'' شائع ہو چکا تھا۔یہ ناول میں نے اپنے چھوٹے بھائی جواہر کے نام معنون کیا تھا جس کی ایک اسکوٹر حادثے میں موت ہوئی تھی۔میرے ماں باپ اس حادثے سے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔میں اسی سال اپنی گھر والی کو دلی لے کر گیا۔میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سفر ہمارے لئے آخری سفر ثابت ہوگا

اوراس کے بعد ہم کبھی اپنے گھر لوٹ نہیں پائیں گے۔ مجھے آج بھی اپنے والد کا وہ مایوس اور حزیں چہرہ یاد آتا ہے جب وہ دلی کے ایک مکان میں بالکونی میں کرسی ڈال کر آسمان کی گہرائیوں میں اُس آشیانے کو تلاش کرنے لگتے تھے جو اُن سے چھن چکا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اُنہیں روتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

خاکسار کو دلیپ کمار صاحب سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک سال کی وابستگی کے بعد میں ان کے لئے حرزِ جاں بن گیا تھا۔ وہ مجھے اپنی نگاہوں سے دور ہونے نہیں دیتے تھے۔ چونکہ وہ اُردو اور انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان سے مانوس نہیں تھے اس لئے اُنہیں ایک اُردو جاننے والے کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ میں جس طرح اُنہیں ڈائیلاگ لکھ کے دیتا تھا، وہ میری خوش خطی سے کافی خوش ہوتے تھے۔ وہ جس طرح لکھتے تھے، اُس کو پڑھنا بھی آسان نہ تھا۔ دھیرے دھیرے میں اُن کی تحریر سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میں آسانی کے ساتھ اُن کی کوئی بھی تحریر پڑھ لیتا تھا۔ چار پانچ سال بعد میں نے وہ ساری باتیں اور وہ سارے واقعات قلم بند کئے اور انہیں کسی رسالے میں بھیجنے کی تاک میں تھا۔ ایک دن کی بات ہے میں جموں آیا ہوا تھا۔ اُن دنوں دیپک بدکی جموں میں تعینات تھے۔ میں اُن سے ملنے چلا گیا۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ اپنی کہانیاں پاکستان کے جریدوں میں کیوں نہیں بھیجتے۔ میں نے کہا، کیسی بات کرتے ہو بھائی۔ وہ ہماری چیزیں کیوں چھاپیں گے۔ حالانکہ میں اس بات کے حق میں نہیں تھا تاہم میں نے دیپک بدکی سے دو چار ایڈرس لے لئے۔

جب میں بمبئی پہنچ گیا تو ایک دن میں نے دلیپ صاحب پر لکھے مضمون کی پہلی قسط پاکستان کے ایک فلمی رسالے ''مسکراہٹ'' کو بھیج دی۔ مضمون کے ساتھ جو میرا خط منسلک تھا میں نے اس میں نے لکھا تھا کہ اگر آپ کو یہ مضمون پسند نہ آئے تو

اسے تلف کر دیجیۓ گا۔ایک دن میرے گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ایک کرخت آواز مجھے سنائی دی۔سب سے پہلے اُس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا لکھا ہے آپ نے۔مجھے لگا کہ اُنہیں میرا مضمون اتنا واہیات لگا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ کیا لکھا ہے۔میری تو بولتی ہی بند ہو گئی۔تھوڑی دیر بعد اُس نے کہا کہ میں مسکراہٹ کا ایڈیٹر طفیل اختر بول رہا ہوں۔یہ کیا لکھا آپ نے کہ اگر پسند نہ آئے تو اسے تلف کر دیجیۓ۔ارے آپ نے تو مجھے خزانہ بھیج دیا ہے۔آپ جتنی قسطیں لکھ سکتے ہیں،لکھیں۔میں اسے اپنے رسالے میں نہ صرف چھاپوں گا بلکہ اسے کتابی صورت میں بھی پیش کروں گا۔اس بات سے میرے حوصلوں کو پر لگ گئے اور میرے دل میں جو شک وشبہات تھے وہ سب اس ایک فون کال سے رفع ہو گئے۔

اس کے بعد طفیل اختر کے ساتھ میرے مراسم اتنے قریبی اور مضبوط ہو گئے کہ مجھے لگا کہ دور دیش میں میرا ایک بڑا بھائی بیٹھا ہے جسے ہر دم میری فکر لگی رہتی ہے۔یہ سلسلہ سال دو سال تک چلتا رہا۔اس سلسلے کو پاکستانی قارئین نے بے حد پسند کیا۔رسالے میں چھپنے کے بعد ''پرائم ٹائم پبلی کیشنز'' نے اُسے ''دلیپ صاحب'' کے عنوان سے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ چھاپا۔کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔اس کتاب پر بی۔بی۔سی اُردو سروس سے تبصرہ ہوا۔پاکستان کا ایسا کوئی رسالہ یا اخبار نہیں جس نے اس کتاب پر تبصرہ نہیں کیا۔طفیل اختر مجھے ہر رسالے اور اخبار کی کٹنگ بھیجتے رہے۔

2002 میں میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''برف کی آگ'' چھپا تو میں نے اس کی کئی کاپیاں اپنے یار دوستوں کو بھیج دیں اور کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔اس کے بعد 1990 سے 1996 تک میرا قلم خاموش رہا۔جب بھی قلم ہاتھ میں اُٹھاتا تھا تو کشمیر یاد آتا تھا۔اپنے بچھڑے یار دوست یاد آتے تھے۔دل تڑپنے لگتا تھا۔آنکھیں بھر آتی

تھیں۔ کچھ بھی لکھا نہیں جاتا تھا۔ جذبات اس حد تک غالب آجاتے تھے کہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا۔

سہ ماہی رسالے ''انتساب'' کے مدیر سیفی سرونجی ایک دن بمبئی تشریف لائے۔ وہ جب مجھ سے ملنے پالی ہل کے آفس پر آگئے تو اُنہوں نے بہت دیر تک مجھ سے بات کی اور بہت دیر تک میری روداد سنی۔ اُنہوں نے مجھے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ میں اپنے اس درد کو اپنے سینے میں پالنے کی بجائے صفحہ قرطاس پر اُتار دوں۔ وہ دن اور آج کا دن میں اپنے سوز وغم، اپنے رنج ومحن پوری دنیا کے ساتھ بانٹ رہا ہوں۔

اس نئے سفر میں ڈی۔کے۔کنول کہیں پیچھے چھوٹ گیا اور اُس کی جگہ دیپک کنول نے لے لی۔ ڈی۔کے کا نام آتا تھا تو پرانے زخم تازہ ہو جاتے تھے۔ اس درد سے نجات پانے کے لئے میں نے ڈی۔کے کو ہی ہٹا دیا۔ میری اس تبدیلی پر میرے بہت سارے دوست خفا ہوئے۔ اُن کی ناراضگی حق بجانب تھی مگر میری مجبوری بھی کچھ کم نہ تھی، بہرحال اس نئے سفر میں، میں نے اپنے آپ کو نئے سرے سے کھوجا اور اپنی پہچان بنائی۔ اب کے میری کہانیوں کا انداز کچھ الگ تھا۔ نوے سے پہلے کے افسانے لفاظی کے مکڑ جال میں پھنسے ہوتے تھے۔ میں بھی اُسی ڈگر پر چل رہا تھا جس پر میرے کئی سارے پیش رو گامزن تھے۔ وہی بیسویں صدی والا اسلوب، وہی رومانیت۔ میرے اندر اتنا درد بھرا ہوا تھا کہ میں نے اس درد کو ایک نئی شکل میں پیش کیا۔ میری کہانیاں ایک بہتے ہوئے جھرنے کی طرح تھیں جن میں کہیں کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ کہانی کی بنت اور کردار نگاری پر میں نے کسی حد تک دسترس حاصل کی تھی۔ میری کہانیوں کے کردار بناوٹی نہیں بلکہ زندہ جاوید لگتے تھے۔ جیسا کردار ہوتا تھا ویسی ہی

اُس کی بولی ہوتی تھی ۔ان کہانیوں میں افسانہ نگار نہیں بلکہ وہ کردار بولتا تھا۔اگر کسی گوجر کا کردار ہے تو وہ گوجری میں بولے گا ۔اگر وہ پنجابی کردار ہے تو وہ پنجابی میں بولے گا۔میرا مہربان دوست سلیم سالک میری کردار نگاری کا قائل ہے۔ایسی کہانیوں نے مجھے ایک نئی پہچان دی ۔بقول بشیر شاہ کہ لوگ تمہاری کہانیوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ان میں فلمی رنگ ہوتا ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ تمہاری کہانیاں میں جو پکڑ ہوتی ہے وہ قاری کو آخر تک ملنے نہیں دیتی ہے ۔اسی بیچ مجھے پاکستان میں ایک اور بھائی ملا جس نے مجھے دل سے سینے سے لگایا۔اُس کا نام ہے گلزار جاوید ۔گلزار جاوید ایک مشہور افسانہ نگار ہے اور راولپنڈی سے ایک مؤقر دوماہی رسالہ نکالتا ہے جس کا نام ''چہارسوٗ'' ہے

''چہارسو'' کے رابطے میں آکر دوستی کی ایسی بنیاد پڑی جو آج کے اس تاریک دور میں ایک مثال ہے ۔میں نے کئی کہانیاں وقفے وقفے سے اس رسالے کے لئے بھیج دیں جو چھپ گئیں ۔ان کہانیوں کو خوب پذیرائی ملی ۔گلزار جاوید ایک نستعلیق انسان ہے۔چند مہینوں کے اندر اُس نے مجھے دوستی کی ایسی ڈور سے باندھا جو آج تک مضبوط اور مستحکم ہے۔ایک دن گلزار بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں فلمی ہستیوں پر ایک سلسلہ وار مضمون لکھوں ۔اس سلسلے کا نام اُنہوں نے ''ایک صدی کا قصہ'' سوچ کے رکھا تھا۔چند ہفتوں تک میں ادھر اُدھر ہاتھ پاوں مارتا رہا کہ کہیں سے کوئی مواد مل جائے مگر بے سود۔میں نے سوچا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے اس لئے میں نے گلزار جاوید سے معذرت طلب کرنے کی سوچی ۔وہ بھی طے کر کے بیٹھا تھا کہ یہ کام مجھے کسی بھی حال میں کرنا ہی ہوگا ۔اس نے مجھے رائے دی کہ میں انٹرنیٹ کا سہارا لوں ۔ایک بار میں جو اس کام میں جٹ گیا تو پھر میں نہ رکا نہ تھکا ۔یہاں میری افسانہ نگاری کام آئی ۔میں نے ہر مضمون کو اس طرح پیش کیا جیسے میں ایک افسانہ پیش کر رہا

ہوں ۔ پڑھنے والوں کو میرا یہ انداز اتنا بھا گیا کہ وہ میرے مداح ہو گئے ۔ دس سال ہو گئے یہ سلسلہ جاری ہے ۔ ان مضامین کو لاہور کے ایک پبلشر ''علم وعرفان'' پبلی کیشنز نے دو جلدوں میں چھاپا ۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی ۔ یہ سلسلہ قارئین کو اتنا پسند ہے کہ میں نے جب اسے سلسلے کو بند کرنے کی بات کہی تو مجھے کئی اطراف سے بہت سارے فون آئے کہ میں اس سلسلے کو بند نہ کروں ۔ گلزار جاوید نے بھی یہی درخواست کی کہ جب تک ہم زندہ ہیں یہ سلسلہ جاری رہے گا ۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آج دیپک کنول کو ہندوستان میں اتنے لوگ نہیں جانتے ہیں جتنے کہ پاکستان میں ۔ میری اب تک درجنوں کہانیاں پاکستان کے مؤقر رسائل میں چھپی ہیں جن میں تخلیق ، شاداب ، بادبان ، زنجیر ، مسکراہٹ ، چہارسو ، غنیمت ، فکر نو ، منشور ، نو وارد ، ادب لطیف ، فنون ، نکھار ، اُردو معلیٰ وغیرہ ۔ اس کے علاوہ ''پرواز'' لندن ، اور ''زاویہ'' سویڈن میں تواتر سے چھپ رہا ہوں اور ہندوستان کے جتنے بھی اُردو کے رسالے ہیں اُن میں میں چھپ چکا ہوں ۔

میں نے ٹی ۔ وی کے لئے بہت سارے سیریل لکھے اور اُنہیں ڈائرکٹ کیا ۔ میری تحریر کی ہوئی ایک ٹیلی فلم ''سولہ موت'' کو کلچرل اکیڈمی کی طرف سے بہترین ٹیلی فلم کا ایوارڈ ملا ۔ ساتھ ہی اس کے مرکزی کردار ظہور زیدی کو بہترین اداکار کا ایوارڈ ملا ۔ اس ٹیلی فلم کو مشتاق علی خان نے ڈائرکٹ کیا تھا ۔ ایک اور سیریل تھا ''لول ہو آم'' جسے میں نے لکھا اور ڈائرکٹ کیا تھا ۔ اس سیریل کی بھی خوب پذیرائی ہوئی ۔ اسی طرح میں نے چالیس کے قریب سیریل لکھے جو ڈی ۔ ڈی کاشر اور ڈی ۔ ڈی نیشنل سے ٹیلی کاسٹ ہوئے ۔

میرے اب تک کئی افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں ۔ ''برف کی آگ'' 2002 ''پمپوش'' 2011 ''لال پل کا دیوانہ'' 2015 ''میرے گاؤں کا چنار''

2016 ''پوش مال'' 2018 اور ''گنیش بل کا باؤلا'' 2019۔میرے اب تک سات ناول چھپ چکے ہیں۔سب سے پہلے ناولٹ ''کشمکش'' 1970 میں چھپا۔اس کے بعد ''1980 میں ناول ''تماشہ'' چھپا۔1984 میں ناول ''ترنگ'' چھپا جسے کتاب والا پبلی کیشنز دلی نے چھاپا۔1985 میں ایک اور ناولٹ ''نیا سفر'' کتاب والا نے چھاپا۔ 1989 میں ناول ''دردانہ'' چھپا جسے کتاب والا ہی نے شائع کیا۔2005 میں راہی پبلی کیشنز دلی نے میرا ایک ناولٹ ''ہم تیرے ہو گئے'' چھاپا۔اس کا ہندی ایڈیشن بھی راہی پبلی کیشنز نے ہی چھاپا۔2005 میں میزان پبلی کیشن نے ناول ''سلام دین کا ہاوس بوٹ'' چھاپا۔2017 میں پرائم ٹائم پبلی کشنز لاہور نے ''دلیپ صاحب'' نام کی کتاب چھاپی۔2018 میں علم وعرفان پبلیشرز لاہور نے میری کتاب ''ہندی فلموں کے معمار'' چھاپی۔اسی سال میزان پبلشرز نے ''دلیپ صاحب'' کا دوسرا ایڈیشن ''شہنشاہ جذبات دلیپ کمار'' کے نام سے چھاپا۔2019 میں اس کی دوسری جلد چھپی۔پبلشر ''علم وعرفان'' ہی تھا۔رحمانی پبلی کیشنز مالی گاوں،ناسک نے بچوں کے لئے لکھی کہانیوں کا مجموعہ '' چالاک سوداگر'' 2011 میں پیش کیا۔10 جنوری 2014 کو مہاراشٹر سرکار کی ساہتیہ اکیڈمی نے میرے افسانوی مجموعہ ''پمپوش'' کو ایوارڑ سے نوازا جب کہ'' لال پل کا دیوانہ'' کو 2016 میں بہار کی اُردو اکیڈمی نے اعزاز سے نوازا۔اس کے علاوہ مجھے بخشی میموریل ایوارڈ اور ''نگینہ انٹرنیشنل'' نے ایوارڈ دے کر میری عزت افزائی کی۔

میری کئی کہانیاں پنجابی، راجھستانی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کے شائع ہو چکی ہیں۔میں نے دلیپ صاحب کے ساتھ دو فلمیں کیں۔ایک ہے'' آگ کا دریا'' جس کے آج کل بہت چرچے ہونے لگے ہیں۔اُمید کرتا ہوں کہ یہ فلم اب کے شاید ریلیز ہو گی۔دوسری فلم ہے'' کالنگا'' جو کافی چرچے میں رہی۔

1994 سے اب تک میں نے ڈھائی سو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ یہ دیپک کنول کے نام کے تحت لکھے ہیں۔اس سے پہلے ڈی۔ کے۔کنول کے نام سے میں سو دو سو افسانے لکھے تھے جو کہ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے رسالے میں چھپے ہیں۔ یہ سارے پرچے کشمیر کے میرے آبائی گھر میں ہی چھوٹ گئے تھے۔گھر میں آگ کی واردات میں میرا سارا ادبی سرمایہ بھی خاک ہو گیا۔میرے مہربان نور شاہ کو کہیں کوئی پرانا افسانہ ملتا ہے تو وہ مجھ تک کیسے بھی پہنچا دیتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں نے کئی کشمیری افسانے بھی لکھے۔ان کا سہرا مرحوم موتی لال ساقؔی کے سر بندھتا ہے۔ جب بھی میں اکیڈمی میں جاتا تھا تو ساقؔی صاحب سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتے کہ اگلی بار جب یہاں آؤ گے تو ایک کشمیری کہانی لے کے آنا۔اُن کے حکم پر میں کشمیری میں کہانی لکھ کر لاتا تھا جو کہ شیرازہ میں چھپ چکی ہیں۔افسوس کہ میرے پاس ان کا کوئی ریکارڈ نہیں کیونکہ وہ سب کچھ نذر آتش ہو چکا ہے۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں دلیپ کمار کے ساتھ بارہ سال تک جڑا رہا۔ شروع شروع میں اگر میں اُن کے لکھے مکالموں میں کہیں کچھ سدھار کرنے کی کوشش کرتا تو وہ برافروختہ ہو اُٹھتے تھے۔ مجھے ایک دن کا واقعہ یاد ہے۔ہم کرناٹک کے میلی کوٹے میں ''کالنگا'' کی شوٹنگ کر رہے تھے۔اُنہوں نے مجھ سے جو مکالمے لکھوائے تھے میں نے اُن میں ذرا سا ردوبدل کیا۔بس پھر کیا تھا وہ آگ بگولہ ہو گئے اور اُنہوں نے مجھے بھرے یونٹ کے سامنے متنبہ کیا کہ میں اُن کے مکالموں میں کوئی ردوبدل کرنے کی حماقت نہ کروں۔ اُس دن کے بعد میں نے قسم کھائی کہ جو کچھ بھی وہ لکھوائیں گے یا لکھ کر دیں گے میں اُسے من وعن اُن کے سامنے رکھ دوں گا۔ بہت جلد انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ یہ بندہ زبان جانتا ہے اس لئے اس کے بعد

اُنہوں نے مجھے خود ہی یہ چھوٹ دے دی کہ جہاں مجھے سدھار کی ضرورت نظر آئے، بے خوف سدھارے۔ بدقسمتی سے اُن کی صحت جواب دینے لگی اور میں زیادہ دنوں تک اُن کے ساتھ کام نہ کر سکا۔

اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ مجھے اپنی کہانیوں میں سے وہ کون سی کہانیاں ہیں جو مجھے بے حد پسند ہیں۔ایک باپ کے لئے یہ کہنا کہ اُسے اپنے بچوں میں سب سے زیادہ کون سا بچہ پیارا ہے، بڑا مشکل سوال ہوتا ہے پھر بھی میں چند کہانیوں کا یہاں ذکر کروں گا جن سے مجھے کافی پذیرائی ملی۔ ''سنتا کی گوری'' اور ''آغوش''۔ یہ دونوں کہانیاں اُردو کی بہترین منتخب کہانیوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ ''بانگی مرغا'' جسے مرحوم احمد ندیم قاسمی کے ''فنون'' میں بہترین کہانیوں کے زمرے میں جگہ ملی۔ ''لالی کی مکھنی'' جسے پاکستان کے بیشتر نقادوں نے خوب سراہا۔ یہ کہانی لاہور کے ماہنامہ ''تخلیق'' میں چھپی تھی۔ اس کے علاوہ ''رشتے'' ''پوش مال'' ''نانی خیر والی'' ''زون مال'' ''لال پل کا دیوانہ'' ''میر پور کا چاند'' ''آوارہ کتا'' ''بوڑھا چنار'' ''ایک تھا بلبل'' ''رادھا ناچے گی'' ''فاصلے'' ''واسدیو زندہ ہے'' ''شیشے کا گھر'' ''گنیش بل کا باوَلا'' ''ماں روتی ہے'' ''جب امبر روئے'' ''باورا بنسی'' ''زون'' ''کہاں گیا میرا لال'' وغیرہ۔ یہ میری پسندیدہ کہانیوں میں شامل ہیں۔

میں نے ریڈیو کشمیر سری نگر کے علاوہ وودھ بھارتی، ریڈیو کشمیر جموں، ریڈیو کشمیر لداخ اور ذی ٹی وی کے پروگراموں میں حصہ لیا۔ وودھ بھارتی سے میرا ایک انٹرویو دو قسطوں میں نشر ہوا جو یونس خان نے لیا تھا۔ اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ میں نے دوردرشن سری نگر، کاشر چنل، دوردرشن نیشنل اور دوردرشن میٹرو کے لئے بہت سارے سیریلز اور ڈرامے لکھے۔ میں نے ایف۔ایم گولڈ سری نگر کے لئے ایک درجن کے قریب گیتوں بھری کہانیاں لکھیں جو مقبول رہیں۔ خاکسار کو یہ اعزاز حاصل

ہے کہ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی ادبی رسالہ ہو جس میں کہانیاں اور تحریریں شائع نہ ہوئی ہوں۔علاوہ ازیں اب تک خاکسار کی افسانہ نگاری اور ادبی کارناموں پر کئی ایم ۔فل کے تحقیقی مقالے قلم بند کئے گئے ہیں۔

●●●

☆......دیپک بُد کی

ایک معمولی سی زندگی کی کہانی

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ ایک معمولی سی زندگی کو بے شمار اوراق پر بکھیر نا ریگستان میں قدموں کے نشان چھوڑنے کے مترادف ہے۔ ایک ادنیٰ بے نام زندگی میں جھانکنے کی کس کو پڑی ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرا سارا وجود سمٹ کر میرے قلم کی روشنائی بن کر بہنے کے لئے بے قرار ہے۔ ہر ایک رائٹر کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مخفی گوشوں کو بے نقاب کر دے اور قارئین پر یہ ظاہر کرے کہ وہ بھی عام انسانوں کی طرح گناہ اور ثواب کا مجسمہ ہے۔ میری زندگی میں بہت سارے اتار چڑھاو آئے۔ چند ایک کو میں نے زیر کیا اور چند ایک نے مجھے زیر کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر مجھے ہمیشہ زندگی میں سکون، ٹھہراو اور جمود سے جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی رہی۔ جو ہے اس سے میں خوش نہیں ہوتا اور جو نہیں ہے اس کی جستجو رہتی ہے۔ شاید یہی رویہ میرے قلم کو تحریک بخشنے کا سبب رہا ہے۔ بہر حال ایک کوتاہی کا احساس ہمیشہ رہا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی مستقل نصب العین مقرر نہیں کیا نہ ہی کسی ایک نقطے پر فوکس کیا۔ آتی جاتی ہواؤں کا رخ دیکھ کر اپنی کشتی کا بادباں موڑتا رہا۔ اب تک زندگی کا سفر جتنا بھی طے ہو چکا ہے اس میں اگر کہیں کوئی کمی رہ گئی تو وہ اسی تلون مزاجی کے سبب رہی۔

وادیِ کشمیر میں ایک غریب متوسط خاندان میں آنکھ کھولی۔ اس جنت نظیر میں جنم لینا میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ البتہ جنم ایسے موسم میں لیا جب یہ وادی اپنے اوپر

دوزخ کی ردا اوڑھے رہتی ہے۔ برف گھٹنوں تک زمین کو ڈھک لیتی ہے، فریادئیوں کی مانند کھڑے بے برگ سفیدے سرد آہیں بھرتے ہوئے قطار در قطار آسمان کو تکتے رہتے ہیں، چہار سو فضا میں تند و تیز ہوائیں خوف و ہراس پھیلاتی ہیں اور غریب کشمیری اپنے گھروں کے اندر لاحول پڑھتے ہیں۔

میرا جنم ۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء کو سرینگر کے پائیں علاقے وازہ پورہ، کرالہ ٹینگ، مہاراج گنج میں ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں ہوا تھا۔ ولادت گھر ہی میں ہوئی تھی۔ محلّہ وازہ پورہ فن طباخی اور سیاسی گروہ بندی کے سبب مشہور بھی تھا اور بدنام بھی۔ شاید یہی وجہ تھی کی ہمارے اسلاف اپنا پتہ وازہ پورہ کے بدلے کرالہ ٹینگ لکھنا پسند کرتے تھے۔

کشمیری پنڈتوں میں ہر خاندان کا ایک مخصوص موروثی نام ہوتا ہے جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ عام طور پر یہ نام گوتر سے تعلق رکھتا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بہت ساری تبدیلیاں آتی رہیں۔ خاندانوں کو ان کے پیشے یا نِک نیم سے پہچانا جانے لگا۔ مثلاً بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا ’خشو‘ کہلایا، بڈگام میں رہنے والا بڈگامی ہوگیا، جیوتش جاننے والا ’جیوتشی‘ کہلایا اور سونے کا کام کرنے والا ’صراف‘ بن گیا۔ جہاں تک میرے خاندانی نام کا تعلق ہے اس کے بارے میں بیٹس کے کشمیر گزٹ ۱۸۷۳ء سے کچھ سراغ ملتے ہیں۔ ’بدکی‘ مہاراجہ کے زمانے میں ایک سکّے کا نام تھا جو سونے کی اشرفی سے کم تر تھا اور چاندی کے روپے سے قیمت میں زیادہ۔ اشرفی ۲۰ر ہری سنگھیا روپے کے برابر تھی اور بُدکی ۷ر روپے کے برابر۔ اس سرنیم کے بارے میں روایت ہے کہ ہمارے کسی جدِ امجد کے زمانے میں مکان کی ازسرِ نو تعمیر کے دوران کھدائی کے وقت ’بُد کیوں‘ کا ذخیرہ مل گیا تھا جس کے باعث ہمیں لوگ ’بُد کی والے‘ کہنے لگے جو بعد میں ’بُد کی‘ ہو کر رہ گیا۔

پتا جی کا نام شری رادھا کرشن عرف نیلہ کنٹھ بُد کی اور ماں کا نام شریمتی سوما وتی عرف کملا بُد کی تھا۔ ماں نے ابھی چالیس سال بھی پورے نہیں کئے تھے کہ بھگوان کو پیاری ہو گئیں۔ پتا جی کو میرے دادا کے نا کتخدا چچیرے بھائی پنڈت واسدیو نے گود لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ راشن کارڈ پر ان کے والد کا نام واسدیو لکھا ہوا تھا۔ پتا جی کی تین بہنیں تھیں، تاراشوری عرف گنوتی، مندودھری عرف پرانا شوری اور دلاری عرف رانی۔ شریمتی گنوتی کے پتی پنڈت شام لال صراف ابتدا میں کشمیری دستکاریوں (اخروٹ کی لکڑی کا سامان اور پیپر ماشی) کی تجارت کرتے تھے، پھر 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور بنڈ، ریذیڈنسی روڈ اور نمائش گاہ کی دونوں دکانیں اپنے سالے یعنی میرے پتا جی کے حوالے کر دیں۔ آزادی کے بعد وہ پندرہ برس تک ریاستی کابینہ میں وزیر رہے اور مزید پانچ برس لوک سبھا کے ممبر رہے۔ اس کے بعد آخری دم تک سماجی کاموں میں جُٹے رہے۔ اِدھر میرے پتا جی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے بہنوئی کی رہنمائی میں تجارت کا پیشہ اپنالیا اور پھر ان ہی کی دی ہوئی دکانیں سنبھال لیں۔ ۱۹۶۱ء میں میری ماں کے لگاتار اصرار پر انھوں نے تجارت چھوڑ کر کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں نوکری کر لی جہاں ان کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ خود میری ماں، جو اپنے پتی دیو کو بحیثیت افسر دیکھنے کی متمنی تھی، اس کے بعد صرف ایک سال زندہ رہی۔ ایمپوریم سے ریٹائر ہونے کے بعد پتا جی نے لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے ایجنٹ کے طور پر آخری دم تک کام کیا اور اپنی محنت کی بدولت کافی کامیاب رہے۔

والدہ کی رحلت کے سبب سارا بوجھ والد کے کاندھوں پر پڑا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۴۵ برس کی تھی، اس لئے ان کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو دوسری شادی کرتے یا پھر باقی ماندہ زندگی رنڈوے کی طرح گزارتے۔ گھر میں تین کمسن بیٹیاں

اور ایک بیٹا تھا، سوانھوں نے دوسرا راستہ اختیار کرلیا۔ پتا جی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ نیک، شریف، حلیم اور خوش گفتار۔ ایسا باپ ملنا نہایت خوش نصیبی کی بات ہے۔ بچپن ہی سے پتا جی نے ایک اچھے دوست کی طرح میری رہنمائی کی۔ وہ نہ تو بچوں پر غصہ کرتے تھے اور نہ کبھی پیٹتے تھے، بس پیار سے سمجھاتے تھے۔ اس طرح سمجھنا تو آسان ہے مگر سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ بہت صبر اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں دوسرے والدین حیا کے نام پر اپنے اور اپنے بچوں کے درمیان دبیز پردے حائل کرتے ہیں، میرے پتا جی نے کمسنی ہی میں مجھے جنسی کجرویوں اور غیر فطری افعال کے مضر اثرات سے آگاہ کیا جس کے لئے میں ہمیشہ ان کی ہمت کی داد دیتا رہا۔ ان کی ہدایت پر میں نے سگریٹ نوشی بھی کئی سالوں تک ترک کی۔ میں نے ساری عمر اپنے باپ کو غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ ان کا ہی کلیجہ تھا کہ ماں کا سارا غصہ پی جاتے اور ان کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ قصوروار ہیں۔ وہ ایذا پسند زندگی بسر کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ یہ ان کی طبیعت ثانی بن چکی تھی لیکن یہی رویہ بیوی کی رحلت کے بعد ان کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ پتا جی کے نہ چاہنے کے باوجود گھر اکھاڑہ بن گیا اور بچے ان کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ والدہ کے اصرار پر انھوں نے دکانداری چھوڑی تھی اور کشمیر ایمپوریم میں نوکری کرلی تھی، جہاں ابتدا ہی سے تنازعہ کھڑا ہوا اور انھوں نے احتجاجاً صرف ۲۰۰/روپے ماہوار تنخواہ لینے کا فیصلہ کرلیا۔ حالانکہ دس بارہ سال کے بعد انھیں انصاف مل گیا اور اسسٹنٹ منیجر کے بدلے منیجر کے پوسٹ پر بحال کیا گیا مگر اتنے برسوں کی بقایا رقم نہیں دی گئی۔ دوسو روپے ماہوار آمدنی اور چار شریر و نافرمان بچے؛ کیسے نبھایا، مجھے اب تک سمجھ نہیں آرہا ہے۔ اِدھر دھیرے دھیرے دُکانیں اور ان میں رکھا ہوا سامان بک گیا اور اُدھر مصیبت پر مصیبت آگئی۔ مکان کی تعمیرنو (پنڈ پنڈ) کے لئے مبلغ

چھ ہزار روپے قرض لئے تھے، چھ ہزار کے بدلے اٹھارہ ہزار کا بھگتان کرنا پڑا، اتارتے اتارتے عمر بیت گئی مگر منہ سے اف تک نہ کی۔ شومیٔ قسمت یہ کہ ایک ہی سال میں موسم سرما میں تین ایکسیڈنٹ ہو گئے۔

مجھے خود کو کشمیری کہلانے میں بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔ کشمیری عام طور پر نیک سیرت اور امن پسند ہوتے ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ بدقسمتی سے سیاسی شعبدہ بازی کے سبب قریباً چار لاکھ کشمیری پنڈتوں کو ۱۹۹۰ء میں کشمیر کی وادی کو خیر باد کہنا پڑا۔ کشمیری پنڈتوں کی آبادی گو بہت قلیل ہے تاہم ان مٹھی بھر لوگوں نے سارے ہندستان میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ انتظامیہ میں کشمیری پنڈتوں کی کامیابی کا راز ان کی ذہانت، گہرائی و گیرائی، طبیعت کی نرمی واعتدال، خوش خلقی، خوش گفتاری، امن پسندی اور صبر و تحمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہرو اور اندرا گاندھی کے دور میں کئی ایسے کشمیری پنڈت تھے جنھوں نے حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور مرکزی سرکار کے صلاح کار رہے۔ عام طور پر یہ لوگ بغل میں فائلیں دبائے گورنمنٹ کی نوکری کرنا پسند کرتے ہیں لیکن ہجرت کے بعد یہ منظر نامہ کافی حد تک بدل چکا ہے۔

'وازہ پور' کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر جو کچھ بھی میں نے حاصل کیا وہ اطمینان بخش ہے۔ تاہم اس ماحول میں جو اپنائیت تھی، جو خلوص تھا وہ دہلی کے ائیر کنڈیشنڈ فلیٹوں میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ محلّہ کشمیری مسلم طباخوں کا محلّہ ہے جس کو دنیا بھر میں 'وازہ وان' (Wazawan) کی وجہ سے شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ اس ایریا کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ کشمیر کا سب سے بڑا تھوک بازار مہاراج گنج اس محلے کے پڑوس میں ہے۔ اس بازار کے کھنڈر آج بھی اپنی پرانی عظمتوں اور رعنائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جن دنوں ہاری پربت قلعے میں لشکری گہما گہمی رہتی تھی، مہاراج گنج یا سری رنبیر گنج کی رونق دیکھتے ہی بنتی تھی یہاں تک کہ عورتیں

بازار میں چلنے سے کتراتی تھیں ۔زین العابدین 'بڈشاہ' کا شہرت یافتہ گنبدوں والا مقبرہ اسی علاقے میں واقع ہے جبکہ کچھ دوری پر عالی کدل اور بلبل لنکر ہے جہاں بلبل شاہ کا مزار ہے۔

میں نے اپنی بنیادی تعلیم گھر کے پاس ہی ایک جبری سکول میں حاصل کی ۔ جبری سکول ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کشمیری مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے قائم کئے تھے۔سکول کیا تھا ایک جھر جھر بھوت بنگلہ تھا جو باہر سے ایسا لگتا تھا کہ اگر زوردار زلزلے کا جھٹکا آجائے تو دھڑام سے زمین بوس ہوجائے گا۔ پرانی لکھوری اینٹوں کا بنا ہوا مکان ، گھاس پھوس کی چھت جس پر مٹی ڈالی گئی تھی، ٹوٹی پھوٹی کھڑکیاں اور دروازے اور دیواروں سے مٹی کا پلستر جگہ جگہ سے اترا ہوا جس کو بچے مزید کھرچ لیتے تھے۔اینٹیں بھی کہیں کہیں اکھڑی ہوئی تھیں جن میں چڑیوں، میناؤں اور کبوتروں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ دائیں بائیں کہیں کوئی سبزہ نظر نہیں آتا تھا۔سکول بلڈنگ کے سامنے ایک بڑا صحن تھا جس میں ہم بچے ریس کے وقت کھیلا کرتے تھے۔کھیلتے کم اور دھول زیادہ اڑایا کرتے تھے۔سکول میں میز تھے نہ کرسیاں۔ ہم لوگ گلی سڑی ٹاٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں سوویت یونین کے دو اہم لیڈر ،نکولائی بلگانن اور نکیتا کریسچوف کشمیر آئے اور ہم سب بچے ہاتھوں میں حریری ترنگے لئے جہلم دریا کے کنارے ان کا استقبال کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ استقبال کا وہ منظر میری آنکھوں میں آج بھی تازہ ہے۔جہلم کے دونوں کنارے ہجوم سے اٹے پڑے تھے۔جس کسی نے وہ منظر دیکھا ہوگا وہ آج کی ویران بستیوں پر افسوس کرتا ہوگا۔ دوسرا پڑاؤ گورنمنٹ ہمدانیہ ہائی سکول نوا کدل کا تھا جہاں ہمارے محلے کے تین اور لڑکے شبن ، پران اور مہاراج اکٹھے تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ پڑھائی کے علاوہ، کھیل کود اور لڑنا جھگڑنا ایک ساتھ ہوتا تھا۔اچھی چوکڑی بن گئی تھی۔

شبن کے ساتھ میری دوستی تیس بتیس سال تک رہی۔ ہمدانیہ سکول میں تین سال قیام رہااور والد کے کہنے پر اردو کے بدلے ہندی مضمون اختیار کیا۔اس سکول میں سگریٹ پینے کی عادت پڑ گئی۔ یہ عادت آہستہ آہستہ میرے ساتھ مستقل طور پر چپک گئی۔اس کے بعد نویں سے ڈی۔اے۔وی سکول چلا گیا۔ چونکہ سائنس سبجکٹس تھے اس لئے انگریزی میڈیم کے ذریعے پڑھائی ہوتی تھی، البتہ دسویں تک ہندی اختیاری مضمون تھا۔اس طرح پرائمری سکول میں جو اردو کے حروف تہجی سیکھ لئے تھے وہ دھیرے دھیرے بھول گیا۔ڈی۔اے۔وی سکول میں سگریٹ پینے کا میرا مشغلہ جاری رہا۔ وہاں مہاراج گنج کا ایک ہم جماعت و دوست رام پرکاش،جس کے پتا جی کا نسوار بنانے کا کارخانہ تھا،اپنی دکان سے سگریٹ لاتا تھا اور ہم دور کانونٹ سکول کے پاس جا کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔

۱۹۶۱ء کے بعد گھر میں ارتھیوں کا جلوس نکلا،اسی سال دادا جی سورگباش ہوئے، پھر دوسرے سال ۱۹۶۲ء میں جب میں مارچ کے مہینے میں آٹھویں جماعت کے بورڈ امتحانات کی تیاری کر رہا تھا، میری ماں جوان مرگ ہوگئی اور اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں جب ہند پاک لڑائی جاری تھی اس وقت میری دادی چل بسی۔اس کے علاوہ جون ۱۹۶۸ء میں میرے ہم عمر پھپھیرے بھائی، اشوک دلال کا انتقال ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک منحوس صبح کو کنجڑن نے ساگ خریدنے کے لئے میری ماں کو آواز دی۔ ماں نے جواب میں کہا کہ محلے میں دوسروں کو بیچ کر واپس آ جانا۔اس دوران ماں نے پران تیاگ دیئے۔اس حادثے سے میرا کمسن دماغ ماؤف ہوگیا مگر صبر وشکیب کی مورت میرے والد نے ہمت بندھائی جس کے باعث میں نے دس روز بعد آٹھویں کے امتحان میں بے دلی سے شرکت کر لی اور کامیاب ہوگیا۔انہی دنوں ہائیر سیکنڈری کورس کا رواج چل پڑا تھا۔ایسا سمجھا جاتا تھا کہ یہ نسبتاً میٹریکولیشن

کے مقابلے میں آسان ہے۔ میرے پتا جی کو نہ جانے کیوں اندیشہ تھا کہ میں علمِ ریاضی میں کمزور ہوں اور میٹرک میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو پاؤں گا، اس لئے پتا جی نے ڈی۔اے۔وی ہائیر سیکنڈری سکول امیرا کدل میں میرا داخلہ کروا دیا جو گھر سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سائیکل پر جانا پڑتا تھا۔ خیر مارچ ۱۹۶۵ء میں ہائیر سیکنڈری (گیارہویں) کا امتحان پاس کیا۔ اس سکول میں ایک استاد تھے، شری شمبھو ناتھ کا چرو۔ ہر فن مولا تھے اور بچوں میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میری شخصیت میں بے خوفی اور ہمت سب انہی کے باعث ہے۔ ان کی بدولت میں نڈر بن گیا، جو میری تحریروں اور دفتری خط و کتابت سے عیاں ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو ۱۷ / دن تک جاری رہی۔ اس دوران شہریوں اور طلبہ کو سول ڈیفنس اور ٹریفک پولیس کی ٹریننگ دی گئی۔ چونکہ میں این۔سی۔سی کا کیڈٹ تھا اس لئے ٹریفک تربیت کے تحت میں نے پلیڈیم سینما کے بالکل سامنے لال چوک کا ٹریفک بیٹ کامیابی سے سنبھالا۔ میری رہنمائی کرنے والا پولیس حوالدار میرے کام سے اتنا خوش ہوا کہ انعام کے طور پر مجھے پلیڈیم سینما میں مفت 'بلف ماسٹر' فلم دیکھنے کے لئے اندر بھیج دیا۔ اُدھر سول ڈیفنس کی تربیت پانے کے بعد کچھ روپے بطور اعزازیہ مل گئے جو جیب خرچ کے کام آ گئے۔

بچپن ہی سے مجھے دو چیزوں میں بہت دلچسپی تھی، ایک کرکٹ اور دوسری مصوری۔ اس زمانے میں دونوں مشغلے غیر منفعت بخش سمجھے جاتے تھے۔ کشمیری پنڈت اپنی اولاد کو ڈاکٹر یا انجینئر بنتے دیکھنا پسند کرتے تھے اس لئے انھیں کتابی کیڑے بنا کر ہی دم لیتے۔ ایسے بچے کھیل کود کو ناپسند کرتے تھے۔ میرے پتا جی نے کرکٹ کا پورا سیٹ خرید کے دیا تھا مگر نزدیک میں نہ کہیں کھیلنے کا میدان تھا اور نہ کوئی سکھانے والا۔ ماں کی ناگہانی موت نے کرکٹ سے کنارہ کشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر

کہیں چوٹ آئی تو کہاں جاؤں گا، گھر میں ماں تو ہے نہیں پھر مرہم پٹی کرانے کے لئے کون لے جائے گا۔ بہت عرصہ بعد یونیورسٹی کے زمانے میں وہائٹس کرکٹ کلب جوائن کر لیا اور شعبۂ بوٹنی کی طرف سے کرکٹ میچ میں حصہ لے لیا۔ کرکٹ کے علاوہ مجھے آرٹ اور پینٹنگ کا بھی بڑا شوق تھا۔ آٹھویں جماعت میں دو بہت ہی خوبصورت واٹر کلر سینریاں بنائی تھیں جنھیں شیخ صاحب، ڈرائنگ ماسٹر نے پسند کیا تھا۔ پھر ڈی۔ اے۔ وی سکول میں ایک تقریب کے لئے جواہر لال نہرو کا ایک خوبصورت پورٹریٹ بنایا تھا جس کی نوک پلک ایک پیپر ماشی آرٹسٹ نے سنواری تھی۔ میرے پتا جی پیپر ماشی کا سامان بیچتے تھے، اس لئے ان کی بدولت مجھے پیپر ماشی کاریگروں سے رابطہ رہتا تھا۔ وہ مجھے خود بنائے ہوئے رنگ اور برش مہیا کرتے تھے۔ پتا جی بھی پینٹنگ کا سامان خرید کر دے دیتے تھے مگر مجھے آرٹسٹ بنانے سے گھبراتے تھے کہ اکیلا بیٹا ہے کہیں آرٹسٹ بن کر جھولا لٹکائے ننگے پاؤں بنجاروں کی طرح گھومنے لگا تو غضب ہو گا۔ لیکن اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔

میری بدنصیبی یہ تھی کہ ماں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا مگر اس کی تلافی کے لئے تھوڑے ہی عرصے بعد نیک سیرت بیوہ پھوپھی، مندودھری، جس کو ہم پیار سے 'جگری' کہتے تھے، نے ہمیں اپنی شرن میں لے لیا۔ پھوپھی کیا تھیں ماں کا ایک بے مثال روپ تھیں۔ بے لوث، ہمدرد، قربانی وایثار کا پیکر اور تجربہ کار عورت تھیں۔ بیوگی کے سبب اس نے سنیاسیوں کی طرح دنیا کو نہیں تیاگا بلکہ دنیا میں رہ کر اس سے کنارہ کشی کر لی اور لوگوں کے دکھ درد کو بانٹتی رہیں۔ یہی تیاگ سب سے بڑا تیاگ ہے، موہ مایا کے بندھنوں سے آزاد، لالچ نام کو نہیں، شک اور وہم سے دور، ورنہ جس عمر میں وہ بیوہ ہوئی تھیں اس عمر میں تو فرشتوں کے بھی قدم ڈگمگاتے ہیں۔ جگری بہت ہی ذہین اور کم گو تھیں۔ ذہین اتنی کہ انتہائی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتیں۔ کم گو اتنی کہ

پہاڑ کا سینہ چاک ہوسکتا تھا مگر اس کے سینے میں چھپا راز افشا نہیں ہوتا۔ افسوس وہ تعلیم یافتہ نہ تھیں ورنہ میرا یقین ہے کہ اس نے بیوہ ہونے کے باوجود اپنا نام روشن کیا ہوتا۔ شادی کے کچھ ہی برس بعد شوہر کی موت واقع ہوئی مگر مشترکہ سسرالی کنبہ اس کی بہت عزت کرتا تھا اور جب بھی کوئی جھگڑا ہو جاتا یا کوئی مسئلہ آن کھڑا ہوتا تو صلاح مشورہ کے لئے اس کے پاس دوڑے چلے آتے اور اس پر عمل بھی کرتے۔ جگری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نفاق کے بدلے اتفاق کو ترجیح دیتیں اور گھروں کو ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچانے کی کوشش کرتیں۔ برسوں سے لڑتے جھگڑتے دشمنوں کو وہ منٹوں میں دوست بنانے میں کامیاب ہو جاتیں۔ نفاق میں اتفاق پیدا کرنے کا ہنر کوئی ان سے سیکھ لیتا۔

سکول اور کالج میں کئی اساتذہ نے مجھے متاثر کیا۔ ڈی۔ اے۔ وی سکول کے شری شمبو ناتھ کاچرو اور ایس۔ پی۔ کالج کے جناب بشیر احمد کا نام لینا یہاں پر ضروری ہے۔ اول الذکر نے مجھے بولڈ اور نڈر بنایا جبکہ دوسرے نے حلیمی اور شرافت کا سبق سکھایا۔ اورینٹل کالج کے جناب جی۔ ایم۔ وفائی نے اردو کی خوش نویسی سکھائی۔ اساتذہ کے علاوہ جس شخصیت کا اثر میری زندگی پر پڑا وہ میرے پھوپھا پنڈت شام لال صراف تھے جن کی شادی تارا شوری سے ہوئی تھی۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ انھوں نے مجھے اپنی شاگردی میں لے لیا تھا مگر میں بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر ان کی سوچ اور فکر اور طور طریق سے متاثر ہوتا رہا۔ مذہب سے عقیدت، علم سے رغبت، اردو سے محبت اور کھدر پہننے کی عادت سب ان کی دین ہے۔ تاہم اتنا اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ زندگی کے کئی شعبوں میں ان کے اصولوں سے روگردانی بھی کر لی۔ صراف صاحب ایک متوسط طبقے کے آدمی تھے جنھوں نے ٹینڈل بسکو میموریل سکول میں تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ سکول کا موٹو تھا 'ہر میدان میں مرد بنو' (In all things be men)

اس لئے ان کے کردار میں راست بازی، جرأت مندی اور نظم وضبط کا عنصر غالب تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے کشمیری دستکاریوں کی دو دکانیں سنبھالیں، ایک جہلم کے بنڈ پر اور دوسری نمائش گاہ میں۔ اچھا خاصا بزنس چل رہا تھا۔ آمدنی بھی معقول تھی۔ اس زمانے میں کشمیری نوجوان مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف آواز اٹھانے لگے تھے۔ وہ بھی اس میدان میں کود پڑے اور اپنی زندگی قوم کی خاطر وقف کی۔ بزنس اپنے سالے یعنی میرے پتاجی کے حوالے کردی۔ ابتدا میں ہندوؤں کی جماعت 'یووَک سبھا' میں شامل ہوئے اور جب شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کردیا تو ان کی قیادت قبول کرکے نیشنل کانفرنس کے رکن بن گئے۔ 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک کے سلسلے میں انھیں کئی بار جیل جانا پڑا جن میں کٹھ جیل کی نظر بندی سب سے خطرناک تھی۔ صراف صاحب مہاتما گاندھی کے پرستار تھے، کھدر زیب تن کرتے تھے اور ان کے اصولوں پر عمر بھر چلتے رہے۔ گاندھی کے علاوہ جواہر لال نہرو کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ وہ شرافت، نفاست اور سادگی کا نمونہ تھے۔ نور کے تڑکے جاگتے تھے، موسم کیسا بھی ہو نہائے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ہر روز یوگ کرتے تھے۔ اس کے بعد بھگوت گیتا، رامائن اور جپ جی کا پاٹھ روزانہ کرتے۔ خوش الحان اتنے تھے کہ میں پاس ہی بستر میں لیٹا کبھی کبھی ان کا پاٹھ سن کر محظوظ ہو جاتا۔ کم گو تھے اور ضرورت سے زیادہ کبھی نہیں بولتے تھے۔ سنا ہے کہ ان کی بیوی تاراشوری عرف گنوتی کو سولہ بچے پیدا ہوئے تھے مگر آخرش ایک ہی لڑکی بچ گئی تھی۔ صراف صاحب ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک ریاستی کابینہ کے وزیر رہے اور پھر مزید پانچ سال لوک سبھا کے ممبر رہے۔

لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صراف صاحب پاپولر رہنما تھے نہ زمانہ ساز سیاست دان، کسی حاجت مند کو کبھی نوکری دلوائی نہ کسی فریادی کی مصیبت کا فوری طور ازالہ کیا لیکن ان کی دیانت داری اور کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے۔ اس بارے میں چند

ذاتی تجربات پیش کررہا ہوں۔ میں نے ٹی ڈی سی فرسٹ ائیر (پری میڈیکل) کا امتحان ۱۹۶۶ء میں ہائی سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ پتا جی کے اصرار پر میں صراف صاحب کے پاس چلا گیا۔ان دنوں وہ ایم پی لوک سبھا تھے۔وہ فرش پر بیٹھے کچھ ٹائپ کررہے تھے۔میں نے سامنے بیٹھ کر اپنا مدعا بیان کیا۔''ٹوٹھا جی، میں نے پری میڈیکل پاس کیا ہے، آپ کسی میڈیکل کالج میں مجھے سیٹ دلوادیں۔'' وہ مسکرائے، مبارکبادد ے کر پھر پوچھ بیٹھے۔''بیٹے، کون سا ڈویژن ہے۔''میں نے جواب دیا'' ہائی سیکنڈ ڈویژن۔'' وہ کچھ دیر چپ رہے۔''بیٹے،فرسٹ ڈویژن ہوتا تو دلوا سکتا تھا، سیکنڈ ڈویژن میں سیٹیں کہاں ملتی ہیں۔'' کچھ اشتعال اور کچھ ناامیدی کے سبب میں نے جھٹ سے جواب دیا۔''فرسٹ ڈویژن ہوتا تو آپ کے پاس کیوں آتا۔خود ہی نامل جاتی۔سیکنڈ ڈویژن ہے تبھی تو آیا ہوں۔''صراف صاحب سنجیدہ ہوگئے اور کہنے لگے۔''کتنا اچھا ہوتا، اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوتے، بیساکھیوں پر جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے کیا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی سنائی۔''ہاں آپ صحیح فرماتے ہیں۔ مسلمان ہوتا تو گھر لے کر آجاتے مگر کیا کروں پنڈت ہوں، میرے لئے تو سیٹیں نایاب ہیں۔'' یہ سن کر وہ بہت خفا ہوگئے، ان کا جلال پہلی بار دیکھ کر میں حیران ہوا۔بولے۔''بیٹے، میرے سامنے ایسی بات آج کی، دوبارہ کبھی نہ کرنا۔تمھیں کیا معلوم کہ کشمیری مسلمان کے لئے ہندستان اوڑی سے قاضی گنڈ تک محدود ہے جبکہ تمھارے لئے ہندستان کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔اگر کشمیری مسلمانوں کو ہم اس محدود بوتل میں بھی بند کرلیں تو ایک وقت آئے گا کہ وہ یہی بوتل ہمارے سر پر پھوڑ دیں گے۔سمجھے!'' میں نے گفتگو کو مزید طول نہیں دینا چاہا۔مگر زندگی کے تجربات نے آگے جا کر مجھے ان الفاظ میں پوشیدہ حقیقت سے آشنا کر دیا۔ میں زندگی کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے لگا۔ بہت عرصہ بعد جب میں نے مرکزی محکمے میں اعلیٰ عہدہ

سنبھالا تو پھوپھا جی کے یہ الفاظ مجھے ہندستان کی اقلیتوں، درجہ فہرست ذاتوں اور قبائلوں کے تیئں انصاف کرنے کے لئے رہنمائی کرتے رہے۔ مذکورہ گفتگو کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس روز کے بعد میں نے پھر کبھی کسی کے پاس مدد مانگنے کے لئے ہاتھ نہیں پھیلائے۔

۱۹۷۰ء کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں ایم۔ ایس۔ سی کا طالب علم تھا۔ اتوار کو پھوپھا جی کے یہاں چلا گیا۔ صراف صاحب جیسا کہ ان کی عادت تھی بستر پر نیم دراز لیٹے ہوئے تھے اور میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے مکالمے کا آغاز کیا۔ ''ٹوٹھا جی، جتنے بھی منسٹر آپ کے رفقائے کار رہے ہیں لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہیں۔ دیکھ لیجیے کس شان وشوکت سے جی رہے ہیں، کیا ٹھاٹ باٹ ہے اور کیسے عیش وآرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک آپ ہیں، پندرہ سال منسٹر اور پانچ سال ایم۔ پی رہے، پھر بھی تنگدستی اور محرومی سے جوجھ رہے ہیں۔ میں آپ کے سالے کا بیٹا ہوں۔ مجھے ایک اچھی سائیکل بھی نصیب نہیں ہوئی، سکوٹر اور موٹر کار کی تو بات ہی نہیں۔'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولے۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میری لمبائی کتنی ہوگی؟'' میں نے بغیر کسی تحمل کے جواب دیا۔ ''ہوگی کچھ چھ فُٹ سے زیادہ۔'' ''اور تمہاری پھوپھی کی؟'' انھوں نے ایک اور سوال پوچھا۔ ''ہوگی کوئی چار فُٹ''۔ میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ انھوں نے پھر سوال داغا۔ ''ہم دونوں کی شکل وصورت کو دیکھ کر کیا تمھیں لگتا ہے کہ ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں؟''۔ ''نہیں'' میں نے بِنا سوچے جواب دیا۔ ''بہت اچھا۔ اب ہماری ذہنی صلاحیت اور رویّے پر غور کرو۔ میں ہندو مسلم سکھ عیسائی، کسی بھی فرقے یا ذات کے آدمی کے ساتھ اٹھتا ہوں، بیٹھتا ہوں اور کھاتا پیتا ہوں مگر تمہاری پھوپھی کو اگر کسی اور مذہب یا ذات کا آدمی اچانک چھو بھی لے تو وہ

پریشان ہوتی ہے اور پہلی فرصت میں مٹی سے نہالیتی ہے کہ مٹی پاک ہوتی ہے۔ بڑے بڑے عہدیداروں کی بیویاں ان کے ساتھ آفیشل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں جبکہ مجھے اکثر اکیلا ہی جانا پڑتا ہے کیونکہ تمہاری پھوپھی وہاں جل بن مچھلی کی طرح مضطرب رہتی ہے۔ کتنی بڑی ذہنی خلیج ہے یہ!'' میں فکر مند ہوگیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔'' سوتو ہے....'' اس کے بعد وہ روحانی خلیج کی طرف مڑے۔'' اور پھر دیکھو روحانی طور پر ہمارا اَن میل۔ وہ اَن پڑھ ہے، رسم ورواج، چاہے کتنا بھی غلط کیوں نہ ہوں، اس پر یقین کرتی ہے۔ اس کے لئے بھکتی سب کچھ ہے، گیان اور کرم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جبکہ میں انسانی وجود کو سمجھنے کی کوشش میں گیان پراپت کرتا ہوں، رشی منیوں کی باتوں کا تجزیہ کرتا ہوں مگر نئی ایجادوں اور طور طریقوں سے منہ نہیں موڑتا۔ میں اپنے ذہن کے دروازے کھلے رکھتا ہوں۔ کیا اس کے بعد بھی تمھیں لگتا ہے کہ ہم فکر اور سوچ اور روحانی طور پر ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں؟ نہ جسمانی مطابقت، نہ ذہنی مطابقت اور نہ ہی روحانی مطابقت....! پھر ہم دونوں میں باہمی یگانگت کے لئے مشترک صفت کونسی ہے؟'' وہ کچھ دیر رک گئے اور پھر گویا ہوئے۔'' بیٹے، اگر میں نے دولت کی لالچ کی ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ میں سگریٹ، شراب اور خوبصورت عورتوں سے پرہیز کرتا اور عین ممکن ہے کہ میں نے کئی دوسرے وزیروں کی مانند اپنی رفیقۂ حیات کو چھوڑ کر دوسری شادی کرلی ہوتی۔ تب تو میں تمھارا پھوپھا نہ ہوتا بلکہ کسی اور کا پھوپھا بن جاتا۔ اس صورت میں تم ایسے ہی ہوتے جیسے اس وقت ہو اور فائدہ کسی اور کو ہوتا۔ کم سے کم اس وقت تم فخر سے مجھے اپنا پھوپھا تو کہہ سکتے ہو۔ ہے نا؟'' ان کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر مجھے چائے بنوانے کے لئے پھوپھی کے پاس بھیج دیا۔ ایک عجیب سی سیکھ تھی اس طویل مکالمے میں۔ انسانی ہم آہنگی اور توافق کی عجیب سی داستاں تھی یہ۔ اتفاق سے کچھ ہی دن پہلے میں نے اپنی

معشوقہ کو خط لکھ کر اسے رشتہ منقطع کیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ ہم دونوں کے بیچ بہت بڑی خلیج ہے۔ اس مکالمے کے فوراً بعد میں تلافی کی غرض سے دہلی چلا گیا تاکہ اسے معافی مانگوں اور کہہ دوں کہ وہ میرے خط پر کوئی دھیان نہ دے اور میں اسے شادی کرنے کے لئے ہر صورت میں تیار ہوں۔ مگر اسے ملنے کے بعد پتا چلا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور میں اپنا سا منہ لے کر واپس کشمیر چلا آیا۔ مذکورہ واقعات نے مجھے صراف صاحب کا معتقد بنا لیا۔ ان کے اصولوں کی سچائی میرے سامنے کھل کر آنے لگی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ''انسان کی شخصیت کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ جسمانی، ذہنی اور روحانی (Physical, Mental and Spiritual)۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان تینوں کے درمیان اعتدال پیدا کرے۔ ہمیں ان تینوں پہلوؤں کی نشو و نما کی جانب دھیان دینا چاہیے۔''

۱۹۶۸ء میں میں نے ایس۔ پی۔ کالج سے گریجویشن کی ڈگری اور ساتھ ہی علم نباتات میں آنرس بھی کیا۔ پتا جی کے ایک دوست پروفیسر بھان نے امتحان میں اچھے نمبر لانے کے گُر سکھائے تھے۔ میری عادت تھی کہ میں امتحانات کی تیاری کرنے میں انتخابیت سے کام لیتا تھا۔ کچھ اہم موضوعات بڑی گہرائی اور گیرائی سے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا جبکہ باقی موضوعات کو نظر انداز کر لیتا۔ اس جامع مطالعہ کے باعث میں امتحان میں طویل جوابات لکھتا تھا جس میں کافی وقت صَرف ہوتا تھا۔ اس طرح ایک دو سوال چھوٹ جاتے تھے اور نتیجتاً میرے نمبر کٹ جاتے تھے۔ بھان صاحب کے سمجھانے سے مجھے یہ احساس ہوا کہ امتحان میں سبھی سوالوں کے لئے منصفانہ طور پر وقت بانٹنا چاہیے اور ہر سوال کا جواب لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کسی سوال کا جواب متعینہ وقت سے تجاوز کرے تو اسے وہیں چھوڑ کر اگلے صفحے سے دوسرے سوال کا جواب لکھنا چاہیے۔ بعد میں اگر وقت مل جائے تو واپس آ کر اس جواب کو مکمل کرنا

چاہیے۔ یہ نسخہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک اور مسئلے سے جوجھنا پڑتا تھا۔ کشمیر میں موسم سرما میں بجلی سپلائی نہیں ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی کمرے میں روشنی اس قدر پھیل جاتی جیسے مقبرے پر کسی نے چراغ رکھ دیا ہو۔ انجام کار گھاسلیٹ کا گلوب لیمپ جلا کر پڑھائی کرنی پڑتی تھی چاہے بجلی ہو یا نہ ہو۔ قومی اخبارات جو دہلی سے شائع ہوتے تھے، سرینگر دن کے دو تین بجے پہنچ جاتے یا کبھی کبھی موسم کی خرابی کے سبب پہنچتے ہی نہ تھے۔ اس طرح ہم لوگ سکول یا کالج سے آنے کے بعد ہی انھیں پڑھ سکتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کالج میں دن بھر مغز پچی کرنے کے بعد دوستوں کے ساتھ کھیلیں یا پھر گھر میں بیٹھ کر اخبار پڑھیں اور وہ بھی گھاسلیٹ کی بتی کے نیچے۔

بی۔ایس۔سی آنرز کر کے میں نے ایم۔ایس۔سی (بوٹنی) میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ بہت اڑچنیں آئیں۔ وہی میرٹ کا چکّر اور سفارشیں۔ بی۔ایس۔سی میں بھی مجھے سیکنڈ ڈیویژن ملا تھا۔ اگر میں ایسا کہوں کہ مجھے زندگی کے ہر امتحان میں سیکنڈ ڈیویژن ہی ملا تو مغالطہ نہ ہوگا۔ البتہ بی۔ایس۔سی۔آنرس میں کامیابی میرے کام آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایم۔ایس۔سی میں ڈاکٹر پی۔کاچرو صاحب کی مدد ہی سے مجھے سیٹ ملی تھی۔ مگر میری بدنصیبی یہ رہی کہ ان کے حریف اِکالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر وی۔کول کی ہمسائیگی اور ان کے کمرے میں میرا آنا جانا ان کو کھلنے لگا اور وہ مجھ سے ناراض ہوگئے۔ ڈیپارٹمنٹ کی اس سیاست سے میں بے خبر تھا، اس لئے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ دوسری طرف گھریلو تناتنی نے مجھے آزردہ کر دیا اور میں نے شراب پینی شروع کر دی۔ شکستہ دلی کے باعث میں نے پڑھائی چھوڑ کر نوکری کرنے کا فیصلہ کر لیا مگر ماما اور جگری نے ایسا کرنے سے روک لیا۔ کھیل کھیل میں ایک روز کلاس میں پروفیسر مہیش شرما کا کارٹون بنایا جس پر وہ بہت ناراض ہوئے اور بات نہ صرف کاچرو

صاحب تک پہنچا دی بلکہ آنے والے پر یویس پریکٹکل امتحان میں اس کا بدلہ بھی لے لیا۔ ایم۔ ایس۔ سی فائنل کے ساتھ ساتھ گاندھی میموریل کالج سرینگر میں بی۔ ایڈ کا داخلہ لیا اور بی۔ ایڈ کر کے پھر ایم۔ اے یا ایم۔ ایڈ کرنے کی ٹھان لی۔ دوسری جانب میں نے اردو سیکھنے کے لئے اسی کالج سے ملحق اورینٹل کالج (ایم۔ پی۔ سکول)، جہاں شام کو پڑھائی ہوتی تھی، میں داخلہ لیا اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب اور ادیبِ ماہر کے امتحانات پاس کیئے۔ تاہم نوکری لگنے کے باعث ادیبِ کامل کا امتحان رہ گیا۔ اس کالج میں ایک بہت ہی نیک استاد سے واسطہ پڑا۔ نام تھا جی۔ ایم۔ وفائی۔ انھوں نے بہت ہی شفقت کے ساتھ میری رہنمائی کی اور میری خوش نویسی پر خاصا دھیان دیا۔ ان کی بدولت میری اردو کی لکھائی بہت اچھی ہوگئی یہاں تک کہ کئی بار میں نے اخباروں میں تفریحاً کتابت بھی کی۔ اِدھر گاندھی کالج میں پہلی بارڈبیٹ میں حصہ لینے کا موقع ملا اور وہاں ناکام ہونے کے سبب گھر جا کر اپنا پہلا افسانہ ''سلمیٰ'' رقم کیا جو اخبار ''ہمدرد'' میں چھپ گیا۔ انہی دنوں صراف صاحب کی وساطت سے میر راجپوری کے روزنامہ ''جہان نو'' میں کارٹون بنانے کے لئے بھی جانے لگا۔ مگر یہ معاملہ زیادہ دیر نہ چل سکا، پھر ہفت روزہ ''نوجیون''، ''ہمارا کشمیر'' اور ''عقاب'' کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ کارٹون کے لئے میں نے اپنا قلمی نام تہجد کی نسبت سے ہجود رکھ لیا تھا کیونکہ 'دیپک' رات ہی میں جلتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد یہ نام غیر مانوس سا لگا اس لئے ترک کر لیا۔ طالب علمی کے دوران ہی میں نواکدل میں واقع اپنے ایک قریبی رشتے دار کے کوچنگ سنٹر میں میٹرک کے سٹوڈنٹس کو ہائی جین پڑھاتا رہا جس کے لئے پچاس روپے ماہوار مل جاتے تھے۔ علاوہ ازیں کئی ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا جن میں سے چند ایک سے معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ دوسرے سال ایم۔ ایس۔ سی (فائنل) کے امتحانات ہوئے۔ وہاں بھی کاچرو صاحب سے ناچاقی ہوئی مگر قسمت نے ساتھ دیا اور معاملہ رفع

دفع ہو گیا۔ فائنل میں مجھے فرسٹ ڈویژن ملا اور پریویس کے نمبر ملا کر سیکنڈ ڈویژن ہو گیا جو میرے لیے باعث تسلی تھا۔ پھر بی۔ ایڈ کی باری آئی۔ اسی دوران میری نوکری کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں لگی اور میری پہلی پوسٹنگ چنڈی گڑھ ہو گئی۔ امتحان دینے کے لئے مجھے چنڈی گڑھ سے آنا پڑتا تھا۔ جوں توں کر کے تھیوری کا امتحان دیا۔ پھر پریکٹس آف ٹیچنگ کے لیے دوبار چنڈی گڑھ سے آنا پڑا۔ رزلٹ نکلا مگر ایک پرچے میں رہ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ سوال سیاسی نوعیت کا تھا اور میں نے متنازعہ جواب لکھا تھا۔ خیر تین مہینے بعد اس پیپر کا دوبارہ امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ کل ملا کر یہاں بھی سیکنڈ ڈویژن ہی میں پاس ہوا۔ اب کیا تھا دونوں ڈگریاں ایم۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایڈ جیب میں تھیں لیکن نوکری ایسی ملی تھی جس کا میری تعلیم سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

جون ۱۹۶۸ء میں بی۔ ایس۔ سی آنرس کے امتحانات سے چند روز پہلے میرے پھپھیرے بھائی اشوک دلال کا اچانک انتقال ہو گیا۔ رات کو گھر لوٹا تو ایک عجیب سی بے یقینی اور بے ثباتی کے احساس نے مجھے مغموم کر لیا۔ ہم عمر رازداں کے اچانک بچھڑنے نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ سارے زخم بھی ابھر آئے جو ماں اور دوسری اموات کے باعث لاشعور میں مخفی تھے۔ اسی رات کاغذ اور قلم کی طلب ہوئی۔ ایک ہی نشست میں چند بے ربط سی نظمیں اور ایک ڈرامہ 'بندھن' لکھ دیا۔ وہ شاید میں نہیں بلکہ میرا غم تھا جو بوند بوند میرے قلم کی سیاہی بن کر ٹپک رہا تھا۔ ایک ناپختہ کوشش، جس میں فلموں کا اثر نمایاں تھا۔ کسی ایک زبان پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے کچھ الفاظ انگریزی میں لکھ دیئے، کچھ اردو میں اور کچھ ہندی میں۔ ''بندھن'' کو میں نے کئی بار سٹیج پر لانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کئی بار ریہرسل بھی ہوئے مگر ڈرامہ اسٹیج کی زینت نہ بن سکا۔ مذکورہ ڈرامے کے باعث کچھ دیر کے لئے اسٹیج کے ساتھ بھی جڑا رہا لیکن پھر اس سے کنارہ کشی کر لی۔ آخر کار اس ڈرامے کا مسودہ ورق

ورق بکھر گیا۔ بہر حال اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ میرے دل میں لکھنے کی چنگاری پیدا ہوگئی۔مشکل یہ تھی کہ مجھے انگریزی، اردو، ہندی یا کشمیری کسی زبان پر دسترس نہ تھی۔ میں نے ڈرامے میں آدھے اردو اور آدھے ہندی کے الفاظ بھر دیئے تھے اور جہاں دونوں زبانوں کے الفاظ نہیں ملتے تھے وہاں انگریزی کے الفاظ استعمال کئے۔اسی لئے میں نے پوسٹ گریجویشن کے دوران یونیورسٹی ٹائم کے بعد اورینٹل کالج میں اردو سیکھنا شروع کیا۔ علاوہ ازیں میں پہلے نورنگ ڈراماٹک کلب اور پھر کلانکیتن کلب، جس کے ریہرسل شوالہ مندر میں ہوتے تھے، کا بھی رکن بن گیا۔کلانکیتن کی طرف سے ایک کشمیری ڈرامہ ’تماہ‘ (طمع) کے دوشو گاندربل اور کنگن میں پیش ہوئے جن میں ،میں نے پولیس انسپکٹر کا رول نبھایا تھا۔ڈرامہ کلب جانے کا میرا مدعا یہی تھا کہ میں تکنیک سمجھ کر ڈرامہ لکھ سکوں مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی، اس لئے میں نے جلد ہی ڈرامہ کلب کو خیر باد کہا۔

جیسا پہلے بھی ذکر آچکا ہے میں نے ۱۹۷۰ء میں گاندھی کالج میں ایک ڈبیٹ میں حصہ لیا۔ میں نے ایک افسانہ لکھا جس میں اس ڈبیٹ کا ذکر تھا۔افسانے کا کوئی عنوان سوجھ نہیں رہا تھا، مایوس ہو کر دستک دینے سے پہلے افسانے کی ہیروئن ’سلمیٰ‘ کا نام بطور عنوان لکھ دیا۔اخبار ’ہمدرد‘ کے دفتر پہنچا۔مدیر کرسی پر بیٹھے کچھ مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے افسانے کا مسودہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ دیکھتے ہی گویا ہوئے۔ ’’بھئی کیا بات ہے، آج کل جو بھی افسانہ آتا ہے اس کا عنوان ’’سلمیٰ‘‘ ہوتا ہے۔‘‘ اس کی ٹرے میں اسی عنوان سے ایک اور افسانہ پڑا ہوا تھا۔پھر بولے۔’’میرے پاس اسی نام کا ایک اور افسانہ پہلے ہی سے پڑا ہوا ہے۔ دیکھتا ہوں جو بہتر ہوگا اس کو آنے والے اتوار کو چھاپ لوں گا۔‘‘ میں مطمئن ہو کر واپس چلا آیا اور اتوار کا انتظار کرتا رہا۔ اخبار تو میرے پاس نہیں آتا تھا، اس لیے صبح سویرے زینہ کدل کے پاس ایک کتب

خانے میں اخبار ڈھونڈا، اسے الٹا پلٹا اور وہاں اپنے افسانے کی پہلی قسط سنڈے ایڈیشن میں چھپی ہوئی دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ زندگی میں شاید ہی پہلے کبھی ایسی خوشی کا احساس ہوا ہو۔ دوسری قسط اگلے اتوار کو شائع ہوئی تو دونوں اخبار بغل میں دبائے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو دکھاتا پھرا۔ ''سلمیٰ'' کے بعد میں ایک اور افسانہ (غالباً 'اُڑن کھٹولہ') لے کر روزنامہ آفتاب کے دفتر پہنچا۔ اندر کمرے میں آفتاب کے مدیر ثنا اللہ بٹ اور ان کے ساتھ کوئی آدمی کھڑے کھڑے محو گفتگو تھے۔ میں نے اندر گھستے ہی سلام کیا جس کا جواب انھوں نے یوں دیا۔ ''ہاں، کیسے آنا ہوا۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''سر، ایک افسانہ لکھا ہے، آپ اسے شائع کر لیں تو ممنون رہوں گا۔'' بولے۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے پھر جواب دیا۔ ''سر، میرا نام دیپک بُدکی ہے۔'' وہ سوال پر سوال کرنے لگے۔ ''کشمیری ہو؟'' میں بھی جواب دیتا رہا۔ ''جی ہاں۔'' پھر وہ کچھ ناصحانہ انداز میں مخاطب ہوئے۔ ''کشمیری اور اردو.....؟ بھئی، کشمیری ہو تو اپنی مادری زبان میں لکھا کرو۔ کشمیریوں کے لئے اردو لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' ان کے لہجے میں روکھا پن تھا۔ میرے جی میں آئی کہ ان سیکڑوں کشمیری ادیبوں کے نام گنواؤں جنھوں نے اردو میں نام کمایا ہے مگر میں نے خود کو روک کر جواب دیا۔ ''سر، آپ افسانہ پڑھ لیجیے، اچھا لگے تو چھاپ لیجیے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے افسانہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے میرے افسانے کے شروعاتی دو پیراگراف پڑھ لئے اور اپنا ردِّ عمل یوں ظاہر کیا۔ ''بھئی، یہ تو 'ماہِ نو' سے چرایا ہوا لگتا ہے۔'' میں حیران و پریشان کہ یہ 'ماہ نو' کیا چیز ہوتی ہے۔ پوچھا۔ ''سر، 'ماہ نو'...میں سمجھا نہیں....؟'' انھوں نے کہا ''لاہور، پاکستان سے جو رسالہ نکلتا ہے۔'' میں نے پھر مودبانہ عرض کی۔ ''جناب میں نے تو آج تک کوئی پاکستانی رسالہ دیکھا بھی نہیں ہے، چوری کرنا تو دور کی بات ہے۔ آپ کو پسند

آئے تو چھاپ لیجیے۔‘‘انھوں نے افسانہ رکھ لیا۔اس دن جب میں گھر لوٹ آیا،خود پر ایک عجیب سا اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔سوچنے لگا کہ کیا اردو زبان پر میری گرفت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ میری تحریر کسی معیاری پاکستانی رسالے کی تحریر لگ رہی ہے ۔میں جامے میں پھولا نہ سمایا۔اس کے بعد میرے افسانے روزنامہ ’’آفتاب‘‘ میں تسلسل کے ساتھ چھپتے رہے۔

اسی زمانے میں میرا ایک افسانہ بعنوان ’کینچلی‘ ہفتہ وار ’’رفتار‘‘، جموں‘ کے مدیر اور مشہور افسانہ نگار موہن یاور نے بڑے اہتمام سے شائع کر لیا۔ دیکھ کر بہت حوصلہ افزائی ہوئی ۔ایک مقامی ہفتہ وار،جس کا نام غالباً ’’نشیمن‘‘ تھا،اس میں ایک اور افسانہ بعنوان ’’ایک دو اور تین‘‘ شائع ہوا۔اس افسانے پر مقامی ناقد بشیر گاشؔ نے کافی تنقید کی تھی اور افسانے کو فلمی کہانی کا ٹکڑا کہا تھا۔ میں نے اس کا فوراً مدلل اور جذباتی جواب دیا تھا مگر بعد میں اس بات کا احساس ہوا کہ بحیثیت افسانہ نگار مجھے تنقید سے نہیں ڈرنا چاہیے اور نقاد کی باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ کچھ عرصے کے بعد ایک اور افسانہ ’’آج جانے دو‘ ماہنامہ ’’تحریک‘ ہلی‘ کو بھیج دیا جو گوپال متّل نے معذرت کے ساتھ واپس بھیج دیا، حالانکہ اس میں دو تین جگہ معمولی اغلاط کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کی گئی تھی۔کافی مایوسی ہوئی مگر کئی برسوں کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ ماہنامہ ’’تحریک‘‘ حقیقت پسند افسانوں کو نہیں بلکہ جدید طرز کے افسانوں کو شائع کرتا ہے۔کئی سال بعد بلراج کومل کی ادارت میں شائع ہونے والے میگزین ’’تعمیر‘‘ہریانہ‘ میں میرا فکر انگیز افسانہ ’’ادھورے چہرے‘‘ چھپ گیا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ایمر جنسی کے دوران میں نے ’’جاگو‘ عنوان سے ایک علامتی کہانی تحریر کی جو رسالہ ’تعمیر‘ سرینگر میں شائع ہوئی۔اس افسانے میں ایمر جنسی پر تنقید کی گئی تھی۔

انہی دنوں اتفاقاً ہفت روزہ اخبار’’عقاب‘ ‘کے مدیر منظور انجم کے ساتھ

تعارف ہوا جو کتابت سے ترقی کر کے اپنا اخبار نکالنے لگا تھا۔ میں بھی ہفتہ وار ’عقاب‘‘ کے ساتھ بحیثیت جوائنٹ ایڈیٹر جڑ گیا اور اپنا فرضی نام ’’ڈی کے سنتوش‘‘ رکھ لیا حالانکہ کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں میری ملازمت بدستور جاری تھی۔ کبھی کبھی میں آدھی رات تک منظور کے گھر میں بیٹھ کر اخبار کے لئے مضامین اور کالم لکھتا، کارٹون بناتا، ایکٹریسوں کی تصویریں بناتا اور موڈ بنتا تو کتابت اور سرخیاں لکھنے میں اس کی مدد کرتا۔ منظور اخبار کی کتابت خود ہی کرتا تھا۔ میں نے اخبار کی نئی وضع کاری (Layout) بھی کر لی تاکہ اس کی الگ پہچان بن سکے۔ اخبار دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا اور ایک ہی سال میں وادی کے اہم اخباروں میں گنا جانے لگا یہاں تک کہ ’’نئی دنیا‘‘ دہلی اور ’’نشیمن‘‘ بنگلور جیسے ہفت روزہ اخباروں کو بھی مات دینے لگا ۔کچھ وقفے کے بعد ہم نے اخبار کا بہت ہی خوب صورت عید ایڈیشن شائع کیا۔ رات دن محنت کر کے ہم نے ایک ضخیم اور رنگین عید نمبر شائع کیا جسے سب لوگوں نے پسند کیا۔ اخبار ملتے ہی روزنامہ ’’آفتاب‘‘ کے مدیر خواجہ ثنا اللہ بٹ نے ایک چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر شکریہ کا نوٹ یوں لکھ کر بھیجا۔ ’’بہت بہت شکریہ۔ ایسا عمدہ ’عید نمبر‘ وادی میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔‘‘ نوٹ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مگر میری نادانی کہیے یا اور کچھ، میں نے اس پرچے کو کوڑے دان میں پھینک دیا۔ آج جب اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو پچھتاتا ہوں۔ مجھے اس کا فریم کروانا چاہیے تھا کہ وہ ہماری محنت کی سرٹیفکیٹ تھی جو وادی کے عظیم ترین صحافی نے دی تھی۔ ’’عید نمبر‘‘ کی کامیابی کے بعد ہم نے ’’محرم نمبر‘‘ نکالنے کی کوشش کی تاکہ شیعہ فرقے تک بھی رسائی ہو مگر منظور انجم نے، جس پر پوری کتابت کا بار تھا، کچھ سستی دکھائی اور پرچہ نویں محرم تک تیار نہ ہوسکا۔ اس دن اخبار کو لے کر پرنٹ کروایا اور آخر کار دسویں محرم کو مارکیٹ میں بھیج دیا۔ مگر محرم کے جلوس میں کچھ ہنگامہ ہوا۔ انجام کار سارے پرچے جوں کے توں

واپس آ گئے۔منظورانجم کے چہرے پر بل پڑ گئے۔خیر ایک شیعہ دوست پروفیسر منظور حسین نے وہ سارے پرچے گھر گھر جا کر بیچ دیئے اور ہمیں روپے تھما دیئے۔ ہمارے دوستانہ سرکل میں دو اور اشخاص تھے جو عید نمبر کی کامیابی دیکھ کر اخبار سے جڑنا چاہتے تھے۔انھوں نے منظورانجم کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ اگلے شمارے میں اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی ان کے نام ادارتی بورڈ میں شامل کر دیئے جب کہ اخبار کی اشاعت میں ان کا رتی بھر بھی یوگدان نہیں تھا۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔کہاں میں اور منظور رات رات بھر جاگ کر اخبار کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے تھےاور کہاں وہ لوگ جنھوں نے کبھی کوئی مدد نہ کی ،ادارتی بورڈ پر حاوی ہو گئے۔مجھ سے رہا نہ گیا اس لئے میں نے دل برداشتہ ہو کر اخبار سے کنارہ کشی کر لی۔اس طرح ’’عقاب‘‘ کے بارے میں میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

طاہر مضطر بھی میرے اچھے دوستوں میں شامل تھے۔ایک زمانے میں ہفتہ وار ’’سلسبیل‘‘ نکالا کرتے تھے۔میری ان سے پہلی ملاقات ’’جہان نو‘‘ کے دفتر میں ہوئی تھی مگر اچھی طرح سے جان پہچان بہت مدت کے بعد ہوئی جو دوستی میں تبدیل ہو گئی۔اس نے اپنے ہفتہ وار ’’پولیٹکل ٹائمز‘‘ میں میرا ایک متنازع مضمون ’’جہیز کوئی لعنت نہیں ،عورتوں کا جائز حق ہے‘‘ شائع کیا تھا۔اس مضمون نے کچھ حلقوں میں ہنگامہ برپا کر دیا اور سنا ہے کہ ایک خاتون نے یونیورسٹی کے ڈبیٹ میں اسی مضمون کو اپنا بنا کر پڑھ لیا اور فرسٹ پرائز جیت لیا مگر میں اس بات کی توثیق نہیں کر پایا۔ایک روز درجن بھر افراد، جن میں اکثر صحافی تھے، کافی ہاؤس میں بیٹھے اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ وادی میں آج کل کون سا ویکلی اخبار اچھا ہے۔سب لوگوں نے شمیم احمد شمیم کے ’’آئینہ‘‘ کو پہلا نمبر دیا جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔جب دوسرے نمبر کی باری آئی تو اکثر لوگوں نے ’’عقاب‘‘ کو دوسرے درجے پر رکھا۔ایک آدمی ،جس کے

بارے میں سنا تھا کہ وہ ریاستی سی۔آئی۔ڈی میں اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے، نے مداخلت کی۔"یار آج کل کوئی مسلمان پنڈت نام اختیار کر کے "عقاب" میں آزادی اور عوامی حقوق کے بارے میں لکھتا ہے اور حکومت کی پرزور مخالفت کرتا ہے، بہت تیز اور نوکیلا قلم ہے اس کا۔" طاہر مضطر مسکرایا، پھر میری طرف دیکھنے لگا کیونکہ وہی ایک شخص تھا جو اس حقیقت سے آشنا تھا۔ وہ جھٹ سے بول پڑا۔"کیوں پنڈت نہیں لکھ سکتا ہے؟" خفیہ پولیس کے آدمی نے کہا۔"ارے تم اس کی تحریروں کو پڑھ تو لو، کوئی کشمیری پنڈت سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔" اس پر طاہر سے رہا نہ گیا اور اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"یہ ہے وہ کشمیری پنڈت، تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔" میری تو نبض ہی رک گئی۔سب میری جانب دیکھنے لگے مگر میں نے حامی بھرنا صحیح نہیں سمجھا۔محفل ختم ہونے کے بعد خفیہ پولیس کے آدمی نے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ میں سچ مچ گھبرا گیا کہ اب تک تو بچ گئے، اب بچنا مشکل ہے۔ بوجھل قدموں سے میں اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے پلیڈیم سینما کی بغل میں "فلورا" ریستوراں میں لے گیا اور وہاں چائے کباب کا آرڈر دے دیا۔ بیٹھنے سے پہلے وہ مجھ سے زور سے بغل گیر ہوا اور کہنے لگا کہ اگر کشمیر میں دو چار ہی تمہارے جیسے نوجوان ہوں تو آزادی ملنا کوئی مشکل بات نہیں۔ میں اس کے رویّے پر حیران رہ گیا کہ انسان کے چہرے سے اس کی حقیقت عیاں نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں ریاستی سرکار کے سابقہ منسٹر پیر غیاث الدین ایک میگزین "علم و دانش" کے نام سے نکالتے تھے۔کئی بار ان سے ملاقات ہوئی اور ان کے رسالے کی ترتیب و تزئین میں بھی مدد کی۔

ریڈیو کشمیر یوواوانی اور جنرل سروسز سے بھی کئی سال وابستہ رہا۔ وہاں مباحثوں اور دیگر پروگراموں میں حصہ لیتا رہا۔ چند ایک کوئز پروگراموں میں بھی بحیثیت کوئز ماسٹر شرکت کی۔ یوووانی کے لئے میں کشمیری میں حالات حاضرہ پر تبصرہ

کرتا تھا۔۱۹۷۴ء میں اسسٹنٹ پروڈیوسر قیوم وڈیرا پروڈیوسر ظفر احمد کے چھٹی پر جانے کے سبب اس کا قائم مقام بن گیا۔ میں نے انہی دنوں ایک خوبصورت افسانہ لکھا،عنوان تھا''ریزے''۔اس نے افسانہ پڑھ کراس کو ڈرامائی روپ دینے کا مشورہ دیا۔میں نے اس میں مناسب مکالموں کا اضافہ کر کے ٹیلی ویژن ڈرامہ کا روپ دے دیا۔دوردرشن،سرینگر نے اس کو پروگرام''ایک کہانی'' کے تحت ٹیلی کاسٹ کرلیا۔ان دنوں سرینگر مرکز کے ڈائریکٹر مظہر امام تھے۔اسی بہانے ان سے بھی رابطہ ہوا اور کئی باران کے ساتھ'زیروِان' ریستوراں میں ملاقات ہوئی۔انھوں نے افسانہ نگاری کے بارے میں مجھے کئی مفید مشورے دیئے جو آگے جا کر میرے لیے کافی مفید ثابت ہوئے۔

۱۹۷۶ء میں آئی۔اے۔ایس اینڈ الائیڈ سروسز کا امتحان پاس کیا جس کی بدولت ٹریننگ کے لئے لال بہادر شاستری اکیڈمی،مسوری جانا پڑا۔وہاں میں نے کالج کے اِن ہاؤس میگزین'چیتنا' کا اردو سیکشن پہلی بار نکالا۔ یہ میگزین زیراکس کر کے نکالا جاتا تھا۔انگریزی اور ہندی کے لئے سٹینسل پر ٹائپ کر کے سائیکلوسٹائل کیا جاتا تھا جبکہ اردو کے لئے سٹینسل پر ہاتھ سے کتابت کرنا پڑی۔کچھ پروبیشنرس کی غزلیں،نظمیں اور افسانے اکٹھے کر کے اس میں شائع کر لیں۔اپنا ایک افسانہ''راکھ کا ڈھیر'' بھی شامل کرلیا۔مسوری کے بعد انڈین پوسٹل سروس کی فیلڈ ٹریننگ کے سلسلے میں اتر پردیش کے شہروں اور قصبوں میں گھومتا رہا۔جن دنوں پی۔ایم۔جی آفس لکھنؤ میں پروبیشنر تھا شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ڈائریکٹر تھے۔ایک روز میں نے ان کے تاثرات جاننے کے لئے اپنے افسانے پیش کئے۔فاروقی صاحب چونکہ جدید تحریک کے بنیاد گزاروں میں سے تھے،اس لئے بیانیہ واظہاریہ افسانے پسند نہیں کرتے تھے، جس کا مجھے علم نہیں تھا۔انھوں نے دو تین روز کے بعد میرے افسانے لوٹاتے ہوئے

کوئی خاص ردِعمل ظاہرنہیں کیا مگران کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ انھیں میرے افسانے پسندنہیں آئے تھے۔میرے پوچھنے پرانھوں نے صرف اتنا کہا۔’’ٹھیک ہیں ۔ان میں سے ایک افسانے’’جاگو‘‘ کا آخری پیراگراف غیرضروری لگتا ہے۔‘‘میں نے ان کی سردرَوی کا یہ مطلب نکالا کہ شاید میرے افسانے اس قابل نہیں ہیں کہ وہ ان پراپنی رائے دے سکیں ۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے میرا دل رکھنے کے لئے خاموشی اختیار کرلی ہو۔اس حوالے سے میں نے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ’’انھوں نے ناک بھوں چڑھائی‘‘ جو میری غلطی تھی کیونکہ انھوں نے کسی ردِعمل کا اظہار کیا ہی نہیں تھا۔اس مبالغہ آمیزی کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔خیر بات آئی گئی ہوگئی مگر میرے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اورافسانے لکھنے کا جو مجھے چاؤ تھا وہ دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا۔تاہم دوتین افسانے مثلاً’’کالا گلاب‘‘،’’سپنوں کا شہر‘‘اور’’راکھ کا ڈھیر‘‘ کانپور سے چھپنے والے رسالوں’’رگِ سنگ‘‘ اور’’گنگ وجمن‘‘ میں شائع ہوئے ۔ایک افسانہ موہن نرمؔل اور باقی دوافسانے دیپک نرمؔل کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ پروبیشن کے بعد میری پہلی پوسٹنگ سرینگر ہوئی اور پھرایک ہی سال کے بعد میں سینا ڈاک سیوا میں ڈیپوٹیشن پر چلا گیا جہاں افسانہ لکھنا اوراپنے خیالوں کا آزادانہ طور پر اظہار کرنا مشکل تھا۔پھربھی فوجی میگزینوں مثلاً’’میل ملاپ‘‘اور’’سینک سماچار‘‘میں دوغیرمتنازع افسانے جیسے’’آج جانے دو‘‘اور’’کون سانام‘‘ بالترتیب شائع ہوئے۔ اس پس منظر میں میں نے اپنی افسانہ نگاری پر بہت غوروخوض کیااوراس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے افسانے رقم نہیں کرنے چاہئیں کیونکہ میرے اکثر و بیشتر افسانے موجودہ نظام کو بے پردہ کرنے اور معاشرے میں ہورہی دھاندلیوں کواجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ایک طرف شمس الرحمٰن فاروقی کا حوصلہ شکن ردِعمل ذہن پر حاوی ہوگیااور دوسری طرف افسانہ نگاری میں کوئی مستقبل نظرنہیں آرہا تھا۔پھرنوکری سے کھیلنا اپنے

پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ میری دلچسپی سٹاک ایکسچینج اور شیئرس میں بڑھ گئی اور چنانچہ میں نے اس میدان میں بہت ساری کتابیں پڑھ لی تھیں اس لئے شیلانگ میں التہاب زائدہ کے آپریشن کے بعد کئی دنوں بستر پر پڑے پڑے ایک کتاب ''سیونگس، انوسٹ منٹ اینڈ انکم ٹیکس فار سیلریڈ ایمپلائیز' (Savings Investment & Income Tax for Salaried Employees لکھ لی مگر پبلشر نہ ملنے کی وجہ سے وہ شائع نہ ہوسکی۔ اُدھر ادب سے میرا واسطہ آہستہ آہستہ منقطع ہوتا چلا گیا۔ شیلانگ ہی میں غالباً ۱۹۸۴ء میں ایک عجیب سا حادثہ پیش آیا۔ میری زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قلم کار ہونے کی وجہ سے شاید میری حساسیت مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچنے اور سوال اٹھانے پر اُکساتی ہے جو گھریلو چپقلش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ سو میں نے اس تخلیقی کارروائی کو یک لخت دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ سوچا تھا کہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ اس ذہنی انتشار کی زد میں آکر میں نے اپنے تمام اَن چھپے مسودے اور چھپی نگارشات نذرِ آتش کر لیں۔ اس وقت جو کچھ بھی میں نے کیا سب وقتی جنون کے تحت کر لیا لیکن بعد میں بہت پچھتانا پڑا۔ اب بھی جب کبھی یاد آتی ہے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ 'جہانِ نو'' ''نوجیون'' اور 'ہمارا کشمیر'' کے کارٹون، وہ ''عقاب'' کی فائلیں جن میں میرے مضامین، افسانے اور کارٹون شائع ہوئے تھے، وہ ''آفتاب'' کے صفحات جن پر میرے بے شمار افسانے میرے فکر و خیال کی ترجمانی کر رہے تھے، وہ ''رفتار'' جموں، 'تعمیر'' ہریانہ او ''تعمیر'' سرینگر کے رسالے جن میں میری کہانیاں محفوظ تھیں اور وہ ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے جو ابھی تشنۂ اشاعت تھے، سب کچھ راکھ ہو گیا۔ اس طرح میری پہلے دور کی تخلیقی کاوشیں نیست و نابود ہو کر رہ گئیں۔

لکھنؤ میں ایک دفعہ فاروقی صاحب کی رہائش پر حاضری دی۔ گفتگو کے

دوران میں نے کہا کہ آپ کی یہ جدید شاعری میرے پلے نہیں پڑتی، سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کے شعرا کیا لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ ''پیچھے الماری سے کوئی سی شاعری کی کتاب نکالو''۔ مجھے جو کتاب سامنے نظر آئی، اٹھا لی۔ کہنے لگے۔ ''اس میں سے کوئی سی نظم پڑھ لو۔'' جب نظم پڑھ لی، تو پھر گویا ہوئے'' کچھ محسوس ہوا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے''۔ میں نے کہا'' ہاں، کچھ تو سمجھ آ گیا۔'' انھوں نے کہا۔'' پھر کیا سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ شاعری سمجھنے کی چیز نہیں ہے بس محسوس کرنے کی چیز ہے۔'' اس دن شاعری کے متعلق میرے ذہن کا ایک اور دریچہ وا ہوا۔ فاروقی صاحب سے ملاقات ہونے سے پہلے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ جدیدیوں کا حال 'بگڑا شاعر مرثیہ گو والا ہے مگر ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ادب کے بحر بیکراں کو پار کر کے اب دوسرے کنارے پر نئے سمندروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اسی طرح فتح پور میں پوسٹ ماسٹری کی تربیت پا رہا تھا کہ ظفر اقبال ظفؔر سے ملاقات ہوئی جو میرے اچھے دوست بن گئے۔ ان کی وساطت سے کبھی کبھار کچھ مقامی شعرا اور افسانہ نگار میرے کاشانے پر آیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔

جہاں تک میرے کیریئر کا سوال ہے، یہ ایک لمبی داستاں ہے مگر میں اس کو اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ۱۹۷۱ء میں تعلیم سے فارغ ہوتے ہی مجھے کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم، جو اُن دنوں جموں اینڈ کشمیر ہینڈی کرافٹس (سیلز اینڈ ایکسپورٹس) کارپوریشن کی اکائی تھا، میں پہلی ملازمت بطور اسسٹنٹ منیجر ملی۔ بنیادی تنخواہ -/۱۴۰ روپے ماہوار تھی۔ پتا جی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا مگر میں اس آفر سے بالکل خوش نہ تھا۔ تاہم پھوپھا جی کے اصرار پر نوکری جوائن کر لی اور اس کے ساتھ ہی چنڈی گڑھ برانچ آفس میں تعینات ہوا۔ ایمان داری اور راست بازی نے وہاں پر پریشان کر دیا۔ اُدھر ایم۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایڈ دونوں کی تعلیم کامیابی کے ساتھ مکمل

ہوگئی۔اس لئے ایک اچھی نوکری کی تلاش کرنے لگا۔ایک ہی برس کے بعد اشوکا ہوٹل ،نئی دہلی کے برانچ میں تبدیلی ہوئی ۔ وہاں پر سونیا گاندھی ، دلیپ کمار، دھرمیندر، شتروگن سنہا، ریحانہ سلطان وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔اسی دوران محکمے نے مجھے ہسپانوی زبان سیکھنے کے لئے بھارتیہ ودیا بھون بھیج دیا جہاں میری ملاقات دو آئی۔ایف۔ایس افسروں سے ہوئی اور میرے دل میں بھی سول سروسز امتحان دینے کی خواہش پیدا ہوگئی لیکن سوچنے اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں چار سال لگ گئے۔دہلی میں نوکری کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی رہا کہ مجھے مطالعہ کرنے کے لیے کافی وقت مل جاتا۔میں برٹش لائبریری کا ممبر بن گیا۔وہاں کچھ کتابوں کی مدد سے اپنی انگریزی درست کر لی۔ساتھ ہی خوش خطی بھی سیکھ لی۔پھر جب میری پوسٹنگ واپس سرینگر ہوئی اس وقت بھی میں برٹش لائبریری کا پوسٹل ممبر بنا رہا، وہ ایک طرف کا ڈاک محصول دیتے تھے اور میں دوسری طرف کا۔سنا ہے یہ سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ دہلی میں یو۔ایس۔آئی۔ایس لائبریری کا بھی ممبر بن گیا تھا۔دوسری جانب دہلی میں محکمہ تعلیم میں نوکری ڈھونڈنے کی لگاتار کوشش کرتا رہا۔پہلی بار دہلی سرکار کی طرف سے پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (پی۔جی۔ٹی) کی آفر مل گئی مگر منیجنگ ڈائریکٹر نے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ میرے والد میرے سکول ٹیچر بننے میں راضی نہیں تھے۔مایوسی اور احتجاج کے ملے جلے ردِّعمل کے طور پر میں نے بالائی آمدنی کمانے کا تہیہ کر لیا اور دو چار مہینوں ہی میں میری کایا کلپ ہوگئی۔منیجنگ ڈائریکٹر کو یہ بات پسند نہ آئی اس لیے فوراً سرینگر تبادلہ کر لیا۔وہاں سے میں استعفیٰ دے کر پھر دہلی چلا آیا مگر اس بار بدقسمتی سوار ہوگئی۔جن جاننے والوں پر بھروسہ تھا ان کا تو رویّہ ہی بدل گیا۔جہاں کہیں نوکری ڈھونڈتا، وہاں سے رنجکشن مل جاتا۔دہلی محکمہ تعلیم میں انٹرویو دیا وہاں بھی اسامیاں کم ہونے کے سبب نوکری نہیں ملی۔ایمپوریم

کے مینجنگ ڈائریکٹر کو جب میرے بارے میں معلوم ہوا انھوں نے میرے والد کے ذریعے مجھے واپس بلوایا۔ یہ خبر ملتے ہی میں سرینگر پہنچ گیا اور واپس اپنی نوکری جوائن کر لی، ساتھ ہی بطور پرموشن مینیجر کا گریڈ بھی مل گیا۔

نوکری تو واپس جوائن کر لی مگر اب میں نے جذبات کی رو میں بہنے سے گریز کیا۔ میرے رکھ رکھاو میں سنجیدگی اور بُردباری عود کر آ گئی۔ روزِ اول ہی سے میں نے من میں ٹھان لی کہ اب مجھے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا اور اپنے لئے کوئی نئی راہ نکالنی پڑے گی ورنہ یہ زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔ معلّمی کا فتور میرے ذہن سے کافور ہو گیا اور میں سِول سروسز کی تیاری میں جُٹ گیا۔ ۱۹۷۵ء میں امتحان دیا، کامیابی ملی اور ۱۹۷۶ء میں لال بہادر شاستری اکیڈمی مسوری میں جوائن کر لیا۔ اکیڈمی میں میری تربیت پانچ مہینے کی تھی۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا، اس کے علاوہ کئی جگہیں دیکھ لیں۔ اکیڈمی میں مختلف تہوار منائے جاتے تھے۔ جنم اشٹمی کے لئے مشہور کتھک ڈانسر شوبھنا نرائن، جو اسی سال آئی۔ آر۔ ایس کی پروبیشنر تھی، نے سٹیج پر ڈانس کیا۔ اس کے سٹیج کی تزئین کا کام میں نے اپنے ذمے لے لیا اور کامیاب ہوا۔ پس منظر کے لئے میں نے جوش میں آئی ہوئی جمنا ندی پینٹ کر لی۔ بعد میں جب میں نے اس جہازی پینٹنگ پر نظر ڈالی تو یقین نہیں ہوا کہ یہ میں نے بنائی ہے۔ اسی طرح تمل نائٹ کے لئے بھی میں نے سٹیج کے بیک گراونڈ کے لئے ایک جہازی پینٹنگ بنائی جس پر تمل مندر کا صدر دروازہ 'گوپورم' بنایا گیا تھا۔

اِدھر نوکری ملی اور اُدھر شادی ہو گئی۔ شادی ۲۳/ جولائی کو ہوئی اور ۲۵/ کو سرینگر سے بذریعہ طیارہ دہلی پہنچ کر مسوری چلا گیا۔ پتا جی اس ارینجڈ میرج کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں کسی بڑے افسر یا سیاست دان کی بیٹی سے بیاہ کر لوں تا کہ وہ میری آئندہ زندگی کے لئے مہمیز ثابت ہو۔ اس معاملے میں ہم دونوں کے سوچنے میں

قطبین کا فرق تھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ مجوزہ لڑکی کا والد نہیں ہے اور بڑے کنبے سے تعلق رکھتی ہے اس لئے زندگی کی کٹھنائیوں سے آشنا ہوگی اور میرے گھر میں ایڈجسٹ کرے گی۔ پھوپھی نے بھی اشارتاً کہا کہ تم تجرد پسند ہو اور اتنی بڑی سسرال کے ساتھ تمہارا گزر نہیں ہوگا۔ لیکن نہ جانے کس سحر کے تحت میں اپنی بات پر اڑ گیا اور شادی اسی لڑکی سے کرنے کا فیصلہ کیا، وہ بھی کسی جہیز کے بغیر۔ پتا جی نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے مگر میری شادی میری زندگی کا ناسور بن کر رہ گئی۔ ہم دونوں میں کبھی آپس میں بنی ہی نہیں، یوں سمجھ لیں دو لوگ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ ازدواجی زندگی میں بیوی کی کئی حماقتوں کے سبب کئی مقامات پر شرمسار ہونا پڑا۔

پروبیشن کے دنوں میں یوپی میں کئی جگہیں دیکھنے کو ملیں، بیشتر جگہوں پر گھر والی ساتھ تھی۔ پہلی پوسٹنگ بحیثیت سینئر سپرانٹنڈنٹ کشمیر ڈویژن ہوئی۔ وہاں مصیبت پر مصیبت آ گئی۔ گھر اور دفتر ہر دو جگہ انتشار پھیل گیا۔ دفتر میں ملازموں کی تبدیلی کے باعث بہت تناؤ رہنے لگا۔ سبھی یونینیں میرے خلاف صف آرا ہو گئیں کیونکہ ان کے لیڈروں کی من مانی نہیں چلی۔ انھوں نے کئی روز سٹرائک کی۔ بیوی جھگڑا کر کے میکے چلی گئی جہاں اس نے میری غیر حاضری میں پہلوٹی کے بیٹے کو جنم دیا۔ اسی پس منظر میں بارہ مولہ سے واپس آتے وقت میری جیپ کا حادثہ ہوا اور میرے سینے کی تین پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ بال بال بچ گیا، اگر پوری طرح ٹوٹ جاتیں تو سیدھے دل کو چھید جاتیں اور یہ قصہ رقم کرنے کے لئے میں زندہ نہیں رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک اور ایکسیڈنٹ بیج بہاڑہ کے پاس ہوا جس میں میرے گھٹنے میں چوٹ آئی۔ اس زمانے میں میری افسر ایک تیز طرار عورت تھی جس کے ساتھ میری بنتی نہیں تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ میرا سالانہ خفیہ رپورٹ خراب کر دے مگر قسمت

نے میرا ساتھ دیا اور اس کے افسر، جو ریو یونگ افسر تھا، نے اس کا لکھا رد کر دیا۔ انجام کار میں بچ نکلا اور بغیر وقت ضائع کئے سینا ڈاک سیوا (آرمی پوسٹل سروس) میں چلا گیا جہاں میں تقریباً نو سال ڈیپوٹیشن پر رہا۔ کامٹی میں تین ماہ کی فوجی ٹریننگ کے بعد ۸۱-۸۰ء میں بریلی، ۸۳-۸۱ء میں ٹینگا ویلی، اروناچل پردیش، ۸۵-۸۳ء میں شیلانگ، میگھالیہ اور ۸۸-۸۵ء میں متھرا یوپی میں تعینات رہا۔ اس دوران کیپٹن سے لیفٹننٹ کرنل تک ترقی پائی۔ بریلی میں اپنی مصوری کی صلاحیت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی مگر چند ایک پینٹنگز اور پورٹریٹ بنا کر چھوڑ دیا۔ اتفاق سے اسی سال مجھے اے۔ پی۔ ایس ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے پوسٹل لائف انشورنس کے گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا۔ ٹینگا ویلی سے مجھے موٹر ڈرائیونگ اور مینٹی ننس ٹریننگ کے لئے دو مہینے آرمی سکول فار مینٹیننس اینڈ ٹرانسپورٹ بنگلور (ASMT,Bangalore) جانا پڑا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک گاڑی چلانے سے ڈرتا ہوں۔ شیلانگ میں میس کے علاوہ پانچ مکان بدلنے پڑے۔ وہاں ابتدا میں فیملی کے ساتھ ایک لمبے بیرک نما یک منزلہ رہائش میں رہنا پڑا جو شاید انگریزوں کے زمانے میں گھوڑوں کا اصطبل رہا ہوگا۔ چار کمرے تھے جو ایک قطار میں ایک دوسرے سے جڑے تھے۔ ایک رات بہت زور کی آندھی آئی۔ میں اور میرے بچے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ آدھی رات کے قریب ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں گھبرایا، اٹھا، بجلی جلائی اور اپنے کمرے سے دوسرے کمرے اور پھر تیسرے کمرے میں دیکھتا رہا۔ وہاں بہت بڑا چنار یا نیم کے سائز کا درخت آندھی کی وجہ سے گرا پڑا تھا۔ چھت ٹوٹ چکی تھی اور درخت کمرے کے بیچوں بیچ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ اگر اُس کمرے کی بجائے ہمارے کمرے پر گرا ہوتا تو شاید سارا کنبہ ابد کی نیند سویا ہوتا۔ موت کے ساتھ یہ میرا دوسرا انکاؤنٹر تھا۔

۱۹۸۶ء میں پتا جی کی رحلت ہوئی، گھریلو حالات کے مدنظر میں نے سول محکمے میں واپس جانے کے لئے درخواست دی۔ حالانکہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ بھاری وزن کے موجب میں پھر کبھی فوج میں واپس نہیں آسکوں گا۔ نتیجتاً میں نے ۱۹۸۸ء میں فوج سے ڈسچارج ہو کر سرینگر سرکل آفس میں بحیثیت ڈائریکٹر جوائن کر لیا۔ کشمیر میں یہ دوسری پاری تھی جو میری زندگی کا ایک تاریک باب ثابت ہوئی۔ ۳ سے ۷/ اکتوبر ۱۹۸۸ء تک مجھے ایفرو ایشین پیسی فک پوسٹل ٹریننگ سنٹر بنکاک (APPTC, Bangkok) میں 'ڈاک میں منشیات کا سراغ لگانا' کورس کے لیے بھیجا گیا۔ اسی بہانے بنکاک دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ایک برس بعد اچانک ساری وادی ملی ٹنسی کی زد میں آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف شورش پھیل گئی۔ انھی دنوں میں نے باغ مہتاب چاڈورہ میں ایک کنال دو مرلہ زمین پر اپنے مکان کی تعمیر شروع کروائی تھی۔ ڈیزائن میں نے خود ہی بنایا تھا۔ اِدھر مکان بنتا رہا، اُدھر شہر میں کہیں کہیں بم دھماکے ہونے لگے۔ کچھ ہلاکتوں کی خبریں آنے لگی جن میں کشمیری پنڈت بھی تھے۔ ۲۰-۱۹ جنوری ۱۹۸۹ء کی درمیانی رات میں نہ جانے کیا ہوا، سارا ماحول ہی بدل گیا۔ ویسے بھی وادی میں کشمیری پنڈتوں کی آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ لی اور صبح ہوتے ہی پنڈت لوگ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کسی کو ٹرک ملا، کسی کو سومو اور کسی کو لاری، جو جس میں سمایا، چلتا بنا۔ کسی نے مول تول نہیں کیا۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے۔ سب جموں کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہفتے بھر میں وادی کشمیری پنڈتوں سے خالی ہوگئی۔ اس کے باوجود سب کو ایک موہوم سی امید تھی کہ حالات ٹھیک ہونے کے بعد ہم واپس اپنے گھروں میں آئیں گے۔ اس طرح کشمیری پنڈت اپنے ہی ملک میں رفیوجی بن کر رہ گیا اور آج تک بے گھری جھیل رہا

ہے۔ اکثر لوگ جموں، اودھم پور، نگروٹا وغیرہ میں کیمپوں میں رہنے لگے۔ جس کسی کے رشتے دار تھے وہ عارضی طور وہاں چلا گیا اور جو کرائے پر رہ سکا اس نے کرائے پر مکان لے لیا۔ بہت سارے لوگ تو ملک کے دوسرے بڑے شہروں میں رہنے چلے گئے۔ اِدھر۔ ملی ٹنسی کی ابتدا میں جموں وکشمیر سرکل کا پوسٹ ماسٹر جنرل وید کمار تھا۔ شریف اور قوائد وضوابط کا تابع مگر کچھ حد تک ڈرپوک۔ اس کا شوگر لیول بہت کم ہو گیا اور زبان بالکل کالی پڑ گئی۔ ایک دو بار شیر کشمیر انسٹی ٹیوٹ چلا گیا مگر مجھے خبر ملی کہ وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے اسے خبردار کرلیا اور دہلی جانے کی صلاح دی مگر وہ صحت یاب ہونے کے باوجود دہلی سے واپس نہیں آیا۔ مجھے ڈائریکٹوریٹ سے حکم ملا کہ میں بغیر کسی زائد بھتّے کے پوسٹ ماسٹر جنرل کا کام دیکھ لوں لیکن میں نے اجرت کے بغیر فاضل کام کرنے سے انکار کرلیا۔ میرے خط نے ڈائریکٹوریٹ میں تہلکہ مچا دیا۔ شاید پہلی مثال تھی کہ ایک افسر فاضل کام کرنے کے لئے معقول معاوضہ مانگ رہا تھا۔ سیکریٹری پوسٹ نے ڈائریکٹوریٹ میں کانفرنس بلوائی۔ سبھی ڈی۔ ڈی۔ جی حاضر ہوئے۔ میری چٹھی پر غور کیا گیا۔ ان میں سے ایک نے والنٹیئر کیا کہ میں اپنی نوکری کے علاوہ وہاں کا کام بھی دیکھ لوں گا۔ کشمیر چلا آیا، ایک تو میری حاضر دماغی نے اس کی جان بچالی اور دوسرے اس نے سوچا تھا کہ کام مجھ سے کروائے گا اورخود دہلی میں بیٹھا رہے گا مگر میں نے صاف انکار کر دیا، اس لئے کئی کئی دن سرینگر میں قیام کرنا پڑا۔ خیر افسر کے سامنے 'یس سر، یس سر' کرنے کی تو عادت پڑ ہی چکی تھی۔ مرکزی محکمہ جات کا میں پہلا افسر تھا جس نے اپنے دفتر کا ایک حصہ جموں میں قائم کیا اور وادی سے بھاگے ہوئے مائیگرنٹ ملازمین کو وہاں پر ایڈجسٹ کرلیا۔ میری دیکھا دیکھی میں دوسرے محکموں کے افسروں نے بھی بعد میں ایسی ہی کارروائی کی۔ سرکل آفس ملازموں کے بعد ڈاک خانے کے ملازموں کی بازآبادکاری بھی جموں اور نواحی

علاقوں میں کی گئی اور ضرورت کے مطابق ان کو سرینگر، اننت ناگ اور بارہ مولہ صدر ڈاک خانوں میں بھیجا گیا جہاں ان کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کیا گیا۔وادی کے برانچ پوسٹ آفسوں میں کام کرنے والے بھی بھاگ گئے تھے اور کئی برانچ آفس بند پڑے تھے۔گرامین ڈاک سیوکوں (جی۔ڈی۔ایس) کو بھی، جو محکمے کے مستقل ملازمین نہیں تھے، جموں اور آس پاس کے علاقوں میں ایڈجسٹ کیا گیا۔اس کے علاوہ پبلک کا سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ تھا مائیگرنٹ پنشنروں کا پنشن جموں ٹرانسفر کروانا۔پھر پوسٹ آفس میں کھلے ہوئے کھاتوں کے ٹرانسفر کے لئے ایک سیل بنائی جس کا انتظام ایک دیانت دار ملازم کے ہاتھ میں دے دیا۔چند ہی مہینوں میں لاکھوں کھاتے ٹرانسفر کروائے۔اس کے بعد بچت سرٹیفکیٹوں کا مسئلہ تھا، ہزاروں لوگوں کا سرمایہ ان میں جمع تھا اور وہ ہمارے پاس جوق در جوق آرہے تھے،ان کو بھی بیس ہزار تک بغیر جانچ کے روپیہ دیا گیا۔

کشمیر میں دوسری پاری کے اختتام پر۱۹۹۲ء میں مجھے نیشنل ڈیفنس کالج (این۔ڈی۔سی) کے دس ماہ کے کورس کے لئے دہلی بھیجا گیا۔وہاں پر بری، بحری اور ہوائی فوج، تینوں سے متعلق اعلیٰ افسر تربیت پانے کے لئے آتے ہیں، سِوِل سے بھی کچھ اعلیٰ افسر شریک ہوتے ہیں اور کچھ شرکا بیرونی ممالک کی افواج سے تعلق رکھتے ہیں۔بہت ہی اچھا کورس ہے، کھیل کھیل میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔طعام وقیام کا انتظام این۔ڈی۔سی کی طرف سے کیا جاتا ہے جو کسی فائیوسٹار ہوٹل سے کم نہیں ہوتا۔اس کورس میں فوجی ٹریننگ کے بدلے عالمی جنگی منظرنامے کے بارے میں جانکاری دی جاتی ہے۔مختلف ممالک کی فوجی طاقت، بین الاقوامی جنگی گروہوں اور امداد باہمی کا نقشہ ذہن پر کھنچ جاتا ہے۔اس کے علاوہ شرکا کو دفاع سے متعلق ہندستان کے پہاڑی، میدانی، ریگستانی اور بحری علاقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔اس کورس کی

بدولت مجھے اینڈمان نکوبار، آندھرا کے نکسل علاقے اور راجستھان کے ریگستانی علاقے خصوصاً پوکھران جہاں ایٹم بم کا تجربہ کیا گیا تھا وغیرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ نیز ہندستانی بحریہ کے سمندری جہازوں اور فضائیہ کے طیاروں میں بھی سفر کرنے کا موقع ملا۔ نیشنل ڈیفنس کالج کے توسط سے میں نے چند بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ دبئ، قاہرہ، روم اور پھر فرانس۔ جہاں بھی گئے وہاں کے دفاعی محکمے نے اپنے ملک کی دفاعی تیاریوں کے بارے میں ہم کو آگاہ کیا اور اس طرح ان ممالک کی سوچ اور فوجی تربیت کا بھی علم ہوا۔ کالج کے ضابطے کے مطابق میں نے ایک مقالہ بعنوان 'مسئلہ کشمیر کا آغاز اور دفعہ ۳۷۰' (Genesis of Kashmir Problem & Article 370 of the Constitution) قلم بند کیا۔ مقالہ طویل تھا، اس کے لئے میں نے بہت محنت کی اور کئی کتابوں اور اخباروں میں چھپے مضامین سے استفادہ کیا۔

این۔ڈی۔سی ٹریننگ کے اختتام پر میری پوسٹنگ ڈائریکٹوریٹ کے پوسٹل لائف انشورنس سیکشن میں ہوئی۔ ان دنوں انشورنس سیکٹر میں حکومت نے بدلاؤ لانے کے لیے ملہوترا کمیٹی فار ریفارمز ان انشورنس سیکٹر (Malhotra Committee for Reforms in Insurance Sector) کی تشکیل کی تھی۔ سرمایہ کاری اور انشورنس سیکٹر میں دلچسپی کے باعث میں نے ملہوترا کمیٹی سے خودساختہ دیہاتی ڈاک بیمہ یوجنا منظور کروالی جس کے باعث ڈاک محکمے کو عام دیہی لوگوں کو بیمہ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس سے قبل پی۔ ایل۔ آئی کو صرف سرکاری (مرکزی، ریاستی، پی۔ ایس۔ یو، میونسپلٹی وغیرہ) ملازمین کا بیمہ کرنے کی اجازت تھی۔ دیہی انشورنس مارکیٹ پچاس ہزار کروڑ کا ہے جو میری کوششوں کے سبب ڈیپارٹمنٹ کے لئے کھل گیا۔ البتہ میرے باس کو یہ راس نہ آیا، مجھ سے سارا کام لے کر میرا ٹرانسفر پوسٹل سٹاف کالج کروایا اور میری حصولیابیوں کو اپنے نام کرنے کی کوشش کی ۔ بہرحال ایک بات

میرے ذہن میں ہمیشہ کے لئے بس گئی۔ وہ یہ کہ کام کا انجام ہی اس کا انعام ہوتا ہے ۔کبھی کبھی قدر شناسی اور استحسان کی کمی آدمی کی حوصلہ شکنی ضرور کرتی ہے مگر آخر کار جب وہ اپنی محنت کا ثمر خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔یہی اصول آگے جا کر میری ادبی زندگی میں بھی رہنمائی کرتا رہا۔

پی۔ایل۔آئی کے بعد تعلیمی ادارے، پوسٹل سٹاف کالج، غازی آباد سے جڑنے کا موقع ملا۔وہاں فروری ۹۵ء سے جولائی ۹۶ء تک کام کرتا رہا۔نارمل کام کے علاوہ ایک اہم حصولیابی یہ رہی کہ وہاں میں نے کئی ایکڑ زمین پر خوبصورت باغات لگوائے جن میں ایک گلابوں کا باغ بھی ہے۔اس چمن کو دیکھ کر آج بھی دل خوش ہوتا ہے۔وہاں سے اگرتلا بحیثیت ڈائریکٹر (جولائی ۹۶ءتا جولائی ۹۷ء)اور پھر ترقی پا کر ڈبروگڑھ، آسام ریجن بحیثیت پوسٹ ماسٹر جنرل (جولائی ۹۷ء تا جولائی ۹۸ء) تعینات رہا۔اگرتلا کے ملازمین آج بھی مجھے یاد کرتے ہیں کیونکہ میں نے ان کی بہبودی کے کئی کام کئے۔اس کے بعد ایک بار پھر اپریل ۲۰۰۰ء تک پوسٹ ماسٹر جنرل جموں و کشمیر سرکل کا چارج سنبھالا۔حالات میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی تاہم وہ پہلی سی شدّت نہیں تھی۔ ریاستی سرکار کے ملازمین سیکورٹی کے ساتھ ہوٹلوں میں رہتے تھے، صبح وہاں سے سیکریٹریٹ جاتے اور دفتر بند ہوتے ہی ہوٹلوں میں لوٹ آتے۔ ان کی نقل وحرکت پر پابندی تھی۔محکمہ ڈاک کے ملازمین جی۔پی۔او میں رہتے تھے اور ان کے لئے رہائش، پانی اور بجلی کا انتظام کیا گیا تھا۔اسی دوران ۹۹ء میں کرگل کی جنگ ہوئی۔میں نے فوج میں ۹ سال نوکری تو کی تھی مگر جنگ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا ۔اس لئے کرگل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگ اپنی انتہا پر تھی۔ مولبیک کے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں رات گزاری جہاں سے سرحد پار سے داغے جا رہے گولے صاف نظر آ رہے تھے۔کرگل رفیوجی کیمپوں میں اس بات کو دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ہمارے

ڈاک خانے جو اوپر پہاڑیوں پر تھے اپنے اپنے رفیوجی کیمپ میں عارضی طور پر کام کر رہے تھے اور سبھی ڈاک سیوائیں لوگوں کو مہیا کر رہے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوا اور خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ایسا ہی منظر بارہمولہ میں بھی زلزلہ آنے کے بعد انڈین ایکسپریس کے اخباری رپورٹر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کی باتصویر رپورٹ اخبار میں شائع کی تھی۔ ڈاک محکمے کی اس بے لوث کارکردگی پر میں ہمیشہ ناز کرتا رہا ہوں۔ لداخ میں میرا بلڈ پریشر بہت اونچا ہو گیا اور پھر اس سے کبھی نجات نہیں ملی۔ البتہ وقت کے ساتھ ساتھ عارضہ قلب بڑھتا گیا اور بہت برسوں کے بعد ذیابیطس نے آدبوچا۔ بڑی مدت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ماضی میں کبھی مجھے ایک بار ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سرینگر کا نوتعمیر شدہ مکان فروخت کر کے بوڑی ، جموں میں زمین خرید کر اس پر یک منزلہ مکان تعمیر کیا۔ اس کا نقشہ بھی میں نے خود ہی بنایا تھا تاہم جے۔ ڈی۔ اے سے پاس کروانے کے لئے اس کو باضابطہ طور پر آرکیٹیکٹ سے کاغذ پر اتروایا۔ مکان کا ڈیزائن بہت ہی اچھا تھا۔ دو سیٹ تھے جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہوتے تھے اور جڑ بھی جاتے تھے۔ سامنے والے حصے میں ایک کرائے دار رکھ لیا اور پچھلے والے حصے میں خود رہنے لگا۔

میرا اگلا پڑاؤ وڈودرا، گجرات تھا۔ یہ پہلا مقام تھا جہاں میں نے چار سال کا پورا معیاد عہدہ مئی ۲۰۰۰ء تا جون ۲۰۰۴ء گزارا۔ ابتدا میں وہاں کا ماحول دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا۔ خواتین کسی خوف وخدشے کے بغیر رات بھر گھومتی پھرتی نظر آتیں۔ نوراترا کے دنوں میں پنڈال لگائے جاتے، رات بھر ڈانڈیا ہوتا اور دوشیزائیں رنگ برنگے گجراتی پوشاکوں میں لڑکوں کے ساتھ ناچتی رہتی۔ دیر رات تک سارا گجرات جاگتا رہتا۔ وڈودرا میں ایک آیورودیک حکیم سے بھی ملاقات ہوئی جس نے بہت حد تک میری دل کی بیماری کو قابو میں کر لیا۔ اس کی تصدیق گوا جا کر وہاں کے ہارٹ

سپیشلسٹ نے بھی کی ۔ وڈودرا کے بعد گوا کی سال بھر کی پوسٹنگ ایک نیا اور سہانا تجربہ رہا۔ بالکل ایک نئی تہذیب سے تعارف ہوا۔ وہاں کے لوگ بہت اچھے، مخلص اور دوست پرور ہیں ۔ ذاتی طور پر مجھے یہ جگہ بہت پسند آئی ۔ اکیلا انسپکشن کوارٹر میں رہتا تھا، اپنی صحت کے مطابق ڈھنگ کا کھانا تناول کرتا تھا اور صبح سویرے پانچ کلو میٹر کا مارننگ واک کرتا تھا۔ امراض قلب کا ماہر بھی ملا تھا جو میری صحت کی اچھی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اپریل ۲۰۰۵ء میں میری ترقی بحیثیت چیف پوسٹ ماسٹر جنرل ہوئی اور پھر سے جموں وکشمیر سرکل میں پوسٹنگ ہوگئی۔ اس بار یہاں مارچ ۲۰۰۹ء تک چار سال گزارنے کا موقع ملا۔ وہ جگہ جہاں میری پیدائش ہوئی تھی ، پلا بڑھا تھا، سکول، کالج اور یونیورسٹی گیا تھا اب میرے لئے شہر ممنوعہ بن چکا تھا۔ فی الحقیقت سیکورٹی کے سائے تلے قیدیوں کی طرح جینا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ ایک پیارے دوست، پروفیسر فرید پربتی (مرحوم) کے اصرار پر نہ صرف کئی بار یونیوسٹی چلا گیا بلکہ مغل باغات کی سیر کرنے بھی چلا گیا۔ ظاہراً کشمیر کے حالات سدھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور سیاحوں کی آمد ورفت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی ۔ سیاح بے فکر سرینگر اور دوسرے صحت افزا مقامات کی سیر کرتے تھے۔

مجھے گماں بھی نہ تھا کہ میں کبھی پوسٹل سروسز بورڈ کا ممبر بن جاؤں گا۔ ۹ر مارچ ۲۰۰۹ء کو میں نے ممبر پوسٹل سروسز بورڈ (پلاننگ) کا چارج سنبھالا۔ یہ عہدہ مرکزی سرکار کے ایڈیشنل سیکریٹری کے برابر ہے ۔ یہاں میرے پاس ڈاک خانے کے بلڈنگ پروجیکٹ پاس کرنے کا ادھیکار تھا اور میری کوشش یہ رہی کہ زیادہ سے زیادہ مقامات پر بلڈنگ پروجیکٹس پاس کئے جائیں۔ کشمیر کے جی ۔ پی ۔ او کمپلیکس کے لئے میں نے محکمے کی آرکیٹیک سے فوراً ماسٹر پلان کی نظر ثانی کر کے اس کا نیا پلان بنوایا مگر وہاں کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی ۔ اس

لئے معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بہر حال میرا ریٹائرمنٹ فروری ۲۰۱۰ء میں ہوا۔ جاتے جاتے ایک خوش خبری مل گئی ۔انڈیا انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی نے مجھے راشٹریہ گورو ایوارڈ فار میریٹوریس سروس، آؤٹ سٹینڈنگ پرفارمنس اینڈ رمارکیبل ورک کا حق دار قرار دیا اور یہ ایوارڈ مجھے ۵/مارچ ۲۰۱۰ء کو ڈاکٹر بھیشم نارائن سنگھ، سابقہ گورنر تامل ناڈو اور آسام کے مبارک ہاتھوں سے ملا ہے۔

ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھریلو تناؤ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا گیا۔جس گھر کو بچانے کے لئے میں نے ادب سے کنارہ کشی کر لی تھی وہ اور بھی زیادہ منتشر ہو گیا۔۱۹۹۶ء میں جب زندگی کے حالات سے ہار کر میں غازی آباد سے ترپورا ٹرانسفر ہو گیا تو میں نے قلم کی سیاہی کو اکسیر اعظم سمجھ کر دوبارہ اس کا سہارا لیا۔میرے افسانے پھر سے شائع ہونے لگے۔ان میں کچھ بالکل نئے تھے مثلاً رشتوں کا درد[سخنور۔کراچی]، بٹی ہوئی عورت[تعمیر۔سرینگر]،ڈرفٹ وُڈ[بادباں۔کراچی]، ڈائننگ ٹیبل[اسباق۔پونے]،ایک ہی خط[خوشبو کا سفر۔حیدرآباد]،ادھ کھلی[بیسویں صدی۔دہلی]،بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب[سب رس۔حیدرآباد] اور کچھ وہ افسانے تھے جو ساتویں دہائی میں تخلیق کئے گئے تھے اور سرینگر کے مقامی اخباروں مثلاً روزنامہ آفتاب[ریزے،اچانک،آو کچھ اور لکھیں، یوم حساب] ، روزنامہ ہمدرد[سلمٰی/خودکشی]ہفت روزہ عقاب ہفت روزہ نشیمن[ایک دو اور تین] اور چند ریاستی و غیر ریاستی رسالوں مثلاً ماہنامہ تعمیر سرینگر[جاگو،بٹی ہوئی عورت]،ہفت روزہ رفتار جموں[کینچلی]،تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ[ادھورے چہرے]، چیتنا مسوری[راکھ کا ڈھیر]،رگِ سنگ کانپور، گنگ وجمن کانپور[کالا گلاب]،سینک سماچار دہلی[کون سا نام] میں شائع ہو چکے تھے۔شیلانگ میں میں نے طیش میں آکر انھیں نذر آتش کر دیا البتہ وہ میرے ذہن کے نہاں خانے

میں محفوظ تھے۔دوبارہ لکھنے کے اس عمل سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اب ان افسانوں میں جذباتیت کم اور فکر و تخیل کے ساتھ پختگی زیادہ نظر آنے لگی۔کئی افسانوں میں کچھ تبدیلیاں بھی کی گئیں اور چند ایک کے عنوان بھی بدل دیئے۔مذکورہ افسانے، ماسوائے دو تین کے، میرے پہلے افسانوں کے مجموعے 'ادھورے چہرے' میں ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئے۔اس طرح یہ ققنس راکھ سے پھر پیدا ہوگیا اور میرا ہم راز بن گیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تین چار افسانے ابھی تک نہیں لکھ پایا ہوں گو وہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔امید ہے دیر سویر انھیں بھی رقم کروں گا۔

گزشتہ بائیس برسوں کے دوران میرے چھ افسانوں کے مجموعے -ادھورے چہرے [تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء]، چنار کے پنجے [دوسرا ایڈیشن ۱۴ء]، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی [دوسرا ایڈیشن ۱۸ء]، ریزہ ریزہ حیات [۱۰ء]، روح کا کرب [۱۵ء]، اب میں وہاں نہیں رہتا [۱۷ء]؛ ایک افسانچوں کا مجموعہ- مٹھی بھر ریت [۱۵ء]؛ چار تنقیدی و تحقیقی مضامین اور تبصروں کے مجموعے -عصری تحریریں [۲۰۰۶ء] ،عصری شعور [۰۹ء]، عصری تقاضے [۱۳ء]، عصری تناظر [۱۸ء] اور ایک تحقیقی کتاب -اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار [۲۰۱۷ء] شائع ہوئے ہیں جن کی امید سے بہت زیادہ پذیرائی ہوئی ہے۔''ادھورے چہرے'' اور'' چنار کے پنجے'' کے ہندی ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔میرے فکروفن کے حوالے سے دو کتابیں؛ 'ورق ورق آئینہ- دیپک بُدکی ،شخصیت اور فن' (مرتب: پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری) اور 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری' (مصنف: جاوید اقبال شاہ) بالترتیب ۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی ہیں۔ان کے علاوہ ماہنامہ ''انتساب عالمی'' سرونج نے میرے فکر و فن پر خصوصی نمبر جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء شائع کیا جبکہ ماہنامہ شاعر ممبئی ، ماہنامہ انتساب سرونج اور ماہنامہ اسباق پونے نے میرے

کارناموں پر بالترتیب۲۰۰۴ء، ۲۰۰۶ءاور ۲۰۰۷ء میں خصوصی گوشے شائع کئے۔ کچھ اداروں اور اکادمیوں نے کہانی پڑھنے یا پھر سیمنار میں کوئی مقالہ پیش کرنے کے لئے بھی دعوت دی۔ چند طلبہ نے میری شخصیت اور فکر وفن پر ایم۔فل اور ڈاکٹریٹ کے لئے مقالے قلم بند کئے جن کی تفصیل یوں ہے:

(۱) مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، ایم۔ایس یونیورسٹی بروڈہ، گجرات، ۲۰۱۵ء-'دیپک بُدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ'، مقالہ نگار: ڈاکٹر شیخ صفیہ بانو اختر حسین۔

(۲) مقالہ برائے ایم۔فِل، جموں یونیورسٹی- 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری'، مقالہ نگار: جاوید اقبال شاہ۔

(۳) مقالہ برائے ایم۔فِل،سکول آف ہیومانٹیز ،یونیورسٹی آف حیدرآباد ،حیدرآباد-۴۶، مقالہ نگار: محمد امین نجار۔

(۴)مقالہ برائے ایم۔فِل، سکول آف ہیومانٹیز ،یونیورسٹی آف حیدرآباد ،حیدرآباد-۴۶، 'دیپک بدکی کی افسانہ نگاری: روح کا کرب اور ریزہ ریزہ حیات کے حوالے سے'؛ مقالہ نگار ریاض احمد نجار۔ علاوہ ازیں ایک طالب علم اندور میں میری حیات و کارناموں پر ڈاکٹریٹ کی تھیسز لکھ رہا ہے جبکہ فیصل آباد، پاکستان میں ایک طالبہ ایم۔فِل کے لئے مقالہ تیار کر رہی ہے۔

زندگی کا سفر ابھی جاری ہے، نہ جانے کسی گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔ آٹھ سال ہو گئے ریٹائر ہوئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے بزی رہنا چاہیے اور کوئی کام کرنا چاہیے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ اتنے بڑے پوسٹ پر رہ کر اب کیا کام مل سکتا ہے۔ چھوٹی موٹی نوکری تو کرنے سے رہا۔ پنشن کی رقم اپنے لئے کافی ہے۔ مگر قرابت داروں کو میری صحت کی فکر لگی رہتی ہے جو دواؤں کے سہارے اب تک چل رہی ہے۔ لوگ مشورہ دیتے ہیں مجھے فعال اور مستعد رہنا چاہیے۔ صبح سویرے لمبی لمبی

سیر کرنی چاہئے۔ ڈاکٹر تو مارننگ واک کے بارے میں کہتے کہتے تھک گئے۔مگر میں ہوں کہ اپنے روزمرہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ رات کو دو ڈھائی بجے تک مطالعہ کرنے کی عادت نہیں چھوٹتی۔تب تک نیند بھی نہیں آتی۔ کئی بار بہت کوشش کی لیکن آنکھوں کے پپوٹے بند ہی نہیں ہوتے۔ لیٹے لیٹے ماضی کے کواڑوں پر دستک دیتا رہتا ہوں۔زندگی ایسی ہوتی تو کیا ہوتا، زندگی ویسی ہوتی تو کیا ہوتا۔ گھر میں سب لوگ سوئے پڑے ہوتے ہیں۔ میں اکیلا ہی اپنے ماضی سے جوجھتا رہتا ہوں۔کون جانے پھر کیا ہوتا؟ یہ سب خیالی پلاؤ پکانے والی باتیں ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ میں اکیلا ہی دنیا میں آیا ہوں اور اکیلے ہی پیوندِ خاک ہو جاؤں گا۔

●●●

☆......بلراج بخشی

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

بھائی سلیم سالک کے اصرار پر جب میں نے یہ سطور لکھنا شروع کیں تو معلوم ہوا کہ میرے تخلیقی سفر کا آغاز دوسروں کے تخلیقی سفر کے ابتدائی حالات و واقعات سے بے شک جداگانہ رہا ہوگا، مگراس کا محرک وہی تھا جو کم وبیش سب کا ہوتا ہے یعنی اظہارِ ذات۔

ہم جانوروں یا پرندوں کی زبان تو نہیں جانتے لیکن کئی جانوروں اور پرندوں کو مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہوئے سنا جاسکتا ہے۔کئی پرندے اپنی ماداؤں کو متوجہ کرنے کے لئے رقص کے ذریعے اپنے جذبے کا اظہار کرتے دیکھے گئے ہیں، اس سلسلے میں مور کی مثال واضح ہے۔ازمنۂ قدیم میں غاروں میں رہنے والا انسان غاروں کی دیواروں پر شکار کے مناظر کی تصاویر بنا کر اظہار کی جبلت کا اظہار کرتا تھا۔کہا جاسکتا ہے کہ ان ہی جذبات کا اظہار فنونِ لطیفہ کی شکل میں سامنے آیا۔

اصل میں کئی جبلتوں کے ساتھ اظہار بھی انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ایک ہے جو ہر انسان میں کسی نہ کسی حد تک ودیعت ہے اور جس کا اظہار ہر انسان ہنس کر، گا کر، رو کر کسی نہ کسی صورت میں کر ہی دیتا ہے۔میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

میرے والدین پاکستان کے زیر قبضہ علاقہ پونچھ سے تعلق رکھتے تھے۔ 1947 میں پاکستانی فوج کے پونچھ کے محاصرے کے دوران میرے والدین کو بذریعہ طیارہ پونچھ سے انخلا کروا کر، مظفر آباد اور میرپور سے بچے کھچے ڈیڑھ دو لاکھ پناہ

گزینوں کے ساتھ جموں میں اور ہماچل پردیش میں یہاں وہاں لاکر آباد کیا گیا تھا۔

بعد میں مجھے بتایا گیا کہ جموں کے مضافات میں نگروٹہ کے مقام پر ایک خیمے میں 10 دسمبر (سرکاری ریکارڈ میں 7 دسمبر) 1949 کو میری پیدائش کا حادثہ ہوا تھا۔ لیکن میرے شعور میں یاداشتوں کا اول ترین سلسلہ ادھم پور سے شروع ہوتا ہے جہاں پر ادھم پور کے پٹھار کی شمالی ڈھلان کے سرے پر سرائے کے پاس دیوک ندی کو جانے والی ڈھکّی (پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا پہاڑی راستہ) کے آغاز میں پانچ چھ کمروں کے درمیان ایک صحن کے درمیان میں نے اپنے آپ کو پایا۔ میں نے دیکھا کہ اس چھوٹی سی دنیا میں میرے والدین، میرے ماموں اپنے اہل خانہ سمیت اور میری دونوں خالائیں رہتی ہیں۔ میرے نانا نانی بھی یہیں ہیں۔ سب کے رسوئی گھر اپنے اپنے ہیں۔ سب لوگ ہنستے کھیلتے، لڑتے جھگڑتے، روٹھتے مناتے وہاں رہ رہے ہیں۔

اندھیرے اندھیرے سے بِنا کھڑکیوں کے کمرے تھے جہاں سورج کی روشنی کا بلاواسطہ آنا ممنوع تھا۔ بس یہاں وہاں سے بھٹکتی ہوئی کچھ شعائیں در آتی تھیں۔ ایک بڑا سا کمرہ بھی تھا جہاں دوپہر کو کم اور رات کو لالٹین کی روشنی میں زیادہ نظر آتا تھا۔ ٹین کا چھوٹا سا مخروطی شکل کا مٹی کے تیل کا دیا ہوتا تھا جس کی بتی سے کئی برسوں سے مسلسل اٹھنے والا دھواں کمرے کی چھت کے برگوں اور دیواروں پر جم کر کِلوں (جما ہوا دھواں) بن چکا تھا۔ ایک جانب لکڑی کے دوستونوں کے بیچ باندھی گئی رسی کی بِلنگنی پر لحاف اور کمبل تہہ کر کے لٹکائے گئے ہوتے جنھیں استعمال کے لئے سردیوں میں اتارا جاتا۔ کمرے میں کچھ جگہوں پر ٹند واریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بارش میں مٹی کی چھت جگہ جگہ سے ٹپکتی رہتی۔ بھتاروں (مٹی سے بنی ہوئی دیواریں) پر جگہ جگہ لگائی گئی ٹانڈوں پر گھر کا سامان رکھا رہتا تھا۔ برسات کے موسم میں چھت پر چھوٹے چھوٹے گول پتوں والا کُلفا ساگ اُگ آتا تھا جسے توڑ کر ہم پکاتے تھے۔

میرے نانا پونچھ میں چھاترا علاقے کے سینکڑوں کنال کھیتوں کھلیانوں کے مالک ایسے متمول زمیندار اور باشعور ذیلدار تھے کہ انھوں نے میری ماں کو اس زمانے میں آٹھویں تک پڑھایا تھا، اور آج میں دیکھ رہا تھا کہ میری نانی جو مسلسل دھوئیں میں دمے کی مریضہ ہو چکی تھیں، اس مکان کے برانڈے میں کھاٹ کو دیوار کے ساتھ لگا کر اودائن میں بانس کی پتلی پتلی تیلیاں پھنسا کر پھُندنے والے ریشمی ازار بند بُن رہی ہیں، جنہیں بازار میں بیچا جاتا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ میرپور کے رفیوجی بھی یہی کچھ کرتے تھے۔ وہ آٹے کی بوری لے آتے اور بازار سے بھی کم بھاؤ پر شام تک بوری کا آٹا فروخت کر دیتے اور شام کو خالی بوری کو منافع سمجھ کر گھر لے جاتے تھے۔

وقت بھی کیسے کیسے تاریخی مذاق کر دیتا ہے لوگوں کے ساتھ۔ آج تو رفیوجیوں کیلئے اقوام متحدہ نے کیا کیا نہیں دے رکھا ہے مگر 1947 کے ہم رفیوجیوں کو رفیوجیوں کا درجہ نہ دے کر کوئی کمتر سا جانور سمجھ لیا گیا اور انتہائی بے رحمی سے تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا گیا۔

1957 میں جب میں آٹھ سال کا تھا تو میرے والد بخشی کرپارام کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے چار دنوں کے بعد، پھر ایک مہینے کے بعد، پھر چھ مہینے کے بعد، پھر ایک سال کے بعد، پھر چار سال کے بعد موت سے جڑی ہوئی رسمیں نبھائی جاتی رہیں۔ یہ رسوم قریب ہی مقدس دیوک ندی کے کنارے پر ادا کی جاتی تھیں۔ پھر میرے نانا کا انتقال ہو گیا، پھر نانی کا، اور اس طرح اسی صحن میں موت سے جڑی رسموں کا ایک سلسلہ چلتا ہی رہا جن میں کئی کئی دنوں تک اور کئی کئی مخصوص دنوں پر بلا لہسن پیاز کی دال سبزی، پوڑی اور کھیر کا پروسا جانا مجھے یاد ہے۔ (بلا لہسن پیاز کی دال سبزی اور پوڑی، کھیر سے مجھے آج بھی وحشت ہوتی ہے)۔

ہم گھر میں پہاڑی (پوٹھوہاری کی ایک بولی) میں بات کرتے تھے۔ گھر کی

اس محفوظ دنیا سے باہر نکلنے کا واحد راستہ گھر کی ڈیوڑھی تھا۔ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر جب میں اسکول جانے لگا تو وہاں اس خطے کی زبان ڈوگری کو سنا۔لیکن اسکول میں ہندی اور اردو دونوں رائج تھیں، دونوں پڑھائی جاتی تھیں۔ میری والدہ رام پیاری شرما نے مجھے اردو پڑھانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح میری تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔

میری والدہ جواں عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں۔وہ ہروقت اس غم میں آزردہ رہتی تھیں۔میرا بھائی اشوک مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔والدہ اکثر ہمیں اپنی گود میں لے کر میرے والد کو یاد کرتیں اور روتی رہتی تھیں۔محاصرہ پونچھ سے بذریعہ طیارہ انخلا کے وقت میرے والد پونچھ میں پولیس سب انسپکٹر کے طور پر تعینات تھے۔والدہ میرے والد کی پولیس یونیفارم،گھوڑسواری کی برجیس،ان کے رینک کے ستارے،شانہ رسن، بیلٹ،کراس بیلٹ، پولیس کیپ اور اس قسم کے دوسرے Memorablia ہم دونوں بھائیوں کو دکھاتی اور روتی رہتی۔ یہ ایک بہت دلدوز منظر ہوتا تھا جسے دیکھ کر میں بھی رونے لگتا تھا اور میرا بھائی بھی۔انھیں چیزوں میں میرے والد صاحب کی ایک ڈائری بھی تھی۔

جب میری عمر چالیس سے بھی تجاوز کر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ سرزمین پونچھ کا یہ خاصہ ہے کہ وہاں کا ہر تیسرا شخص شاعر ہو یا نہ ہو، تخلص ضرور رکھتا ہے۔چنانچہ آپ کو وہاں (کم سے کم اس دور میں) کئی اس قسم کے لوگ مل جاتے تھے جن کے نام موہن لال زخمی یا سریندر سنگھ باغی یا کچھ بھی ہوتا اور اس کے ساتھ تخلص کا لاحقہ ضرور ہوتا۔اگر آپ پوچھیں کہ بھائی آپ نے زخمی تخلص کیا ہے تو کیا آپ شاعر ہیں؟ تو جواب ملے گا کہ لو جی،شاعری اپنی جگہ ہے تخلص اپنی جگہ۔شاعری کا تخلص سے کیا تعلق؟ (ایسا مجھے بتایا گیا ہے)۔بہرحال اس سارے خطہ پیر پانچال کا یہ وصف ہے کہ یہاں کی دو بڑی ادبی شخصیتوں،کرشن چندر اور چراغ حسن حسرتؔ کی وجہ سے یہاں کے عوام و

خواص کا مزاج اور ذوق آج بھی واضح طور پر ادبی ہو گیا ہے۔

میرے والد شاعر تو نہیں تھے لیکن اس ڈائری میں انھوں نے اس زمانے کے مشہور فلمی گانے یا کچھ مشہور اشعار وغیرہ لکھ رکھے تھے جنھیں میری والدہ مجھے اکثر سنایا کرتی تھیں۔ کچھ طبیعت میں بھی موزونیت رہی ہوگی کہ اس طرف میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ 1947 کے پناہ گزینوں کو حکومت نے کبھی کچھ نہیں دیا۔ والد کی وفات کے بعد سارا خاندان ہی بے سہارا ہو گیا۔ نہ کوئی زمین، نہ نقدی نہ کچھ۔ شکر تو یہ ہے کہ اس دور میں میری والدہ آٹھویں پاس تھیں اور اردو، ہندی، گورمکھی کو بخوبی پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ ان کی اس اہلیت پر انھیں یہاں کے گوردوارے میں استانی کا کام ملا اور روکھا سوکھا گزارہ ہونے لگا۔ پھر کئی سال بعد انھیں ٹیچر کی سرکاری نوکری مل گئی۔

ساتویں آٹھویں جماعت میں اسکول کی لائبریری میں ناول دیکھے تو ماں سے پوچھا کہ آپ کے اسکول میں بھی تو ناول ہوں گے، لا دیجیے۔ چنانچہ ماں اسکول سے ناول لانے لگیں۔ گؤ دان، میدان عمل، چوگانِ ہستی، بازارِ حسن، کرشن چندر، منٹو، عادل رشید اور جانے کیا کیا اسی عمر میں پڑھ لئے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ گھر کے اندر ایک بالکل الگ لسانی ماحول تھا، گھر کے باہر ایک یکسر الگ لسانی فضا اور ان دونوں میں کوئی مماثلت یا ہم آہنگی نہیں تھی۔ دونوں کا لہجہ الگ، لفظیات الگ۔ میں بہ یک وقت دونوں لسانی منطقوں میں جی رہا تھا۔ پھر اردو کتابوں کا ایسا ماحول ملا کہ چھٹی جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں اردو میں تک بندی کرنے لگا اور لاشعوری طور پر اردو میرے اظہار کی اختیاری زبان بنتی گئی۔

ماں نے دیکھا کہ بیٹا تو ہر وقت ناولوں میں ڈوبا رہتا ہے تو انھوں نے اسکول سے کتابیں لانا بند کر دیں۔ ان دنوں یہاں ادھم پور کے بازار میں کئی دکانوں پر چھوٹے چھوٹے بورڈ لگے تھے کہ 'یہاں پر ناول کرائے پر ملتے ہیں'۔ دو روپے کی

سکیورٹی تھی اور ایک آنہ کرایہ۔ ان دکانوں پر ابن صفی کی جاسوسی دنیا سے متعارف ہوا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے سِرّی ادبی ترجموں کے بعد آج تک ابن صفی کے سحر میں گرفتار ہوں۔ ماں نے دیکھا تو انھوں نے ادھم پور کے چھوٹے سے قصبے میں کرائے پر ناول دینے والے تمام دکانداروں کو مجھے ناول دینے سے منع کر دیا۔ میں گھر میں آکر بہت رویا گڑگڑایا مگر ماں ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یہ شاید 65-1964 یا تھوڑا آگے کا زمانہ تھا۔

میں ان دنوں نویں یا دسویں میں بوائز ہائر سیکنڈری اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہمارے اسکول میں سائنس بلاک کے ساتھ ڈسٹرکٹ لائبریری تھی۔ میں اس لائبریری میں گیا اور پوچھا کہ مجھے کتابیں کیسے مل سکتی ہیں۔ لائبریرین تھوڑو رام نے بتایا کہ اس کے لئے مجھے بیس روپے کی سکیورٹی جمع کروانی پڑے گی۔ میرے بیک گراؤنڈ والے کسی طالب علم کے لئے 65-1964 میں بیس روپئے بہت بڑی رقم تھی۔ بہرحال میں نے جیب خرچ میں سے بچا بچا کر خفیہ طور پر چھ سات مہینوں میں بیس روپے جمع کر لئے اور لائبریرین تھوڑو رام کو لائبریری کی سکیورٹی دے کر ممبر بن گیا۔ میں آج تک اس لائبریری کا ممبر ہوں۔

ماں بگڑتی رہتی تھیں اور میں اسکول کی کتابوں میں چھپا کر ناول پڑھتا رہتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں گیارہویں میں فیل ہوگیا۔ اگلے سال پاس ہوکر 1967 میں ادھم پور ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اچانک ہم تین چار لوگوں نے ایک دوسرے کو دریافت کرلیا۔ یہ تھے کلدیپ گپتا صابر، سریندر ساجد، آنند سروپ انجم اور میں۔ کلدیپ صابر اچھے افسانے لکھتے تھے اور ان کے افسانوں پر پریم چند کی چھاپ ہوتی تھی۔ سریندر ساجد فیض کے رنگ میں شاعری کرتے تھے۔ صابر اور ساجد اب حیات نہیں ہیں۔ آنند سروپ انجم تین مجموعہ ہائے کلام شائع کر چکے ہیں اور اب خواہی

نخواہی ایک آدھ شعر کہہ لیتے ہیں۔ کالج کے ایام کے دوران ہی جموں کے ادبی لوگوں سے نہ جانے کیسے رابطہ ہو گیا۔ ایک دن جموں سے میکشؔ کاشمیری، پروفیسر منظر اعظمیٰ، عابدؔ مناوری، نورالزماں صدیقی نورؔ، او۔ پی۔ شرما سارتھی، مدن موہن غافلؔ سنگشہری نے یہاں وارد ہو کر انجمن ادب کی تشکیل کی۔ مجھے صدر بنایا اور آنند سروپ انجمؔ کو سیکریٹری۔

جموں کی انجمنِ ادب والوں نے میرا اولین افسانہ ''مشین کا پرزہ'' جموں کے کسی مقامی اخبار میں شائع کروا دیا تھا۔ پھر 1969 میں میرا افسانہ ''چاندنی کا دھواں'' شاعر ممبئی میں شائع ہوا۔ ان دنوں اعجاز حسین صدیقی مرحوم اس کے مدیر تھے۔ شاعر ممبئی میں میرے کئی افسانے شائع ہوئے جیسے: ہم سفر، سورج کا اغوا اور کئی دوسرے۔

ظاہر ہے 1969 میں بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں مجھے ناکام ہونا ہی تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ اگلے دو برسوں میں کہاں کہاں اور کیسی آوارگی ہوتی رہی۔ 1972 میں بی۔ ایس۔ سی پاس کر کے جموں یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں داخلہ لیا۔ اسی دوران کہیں آنند لہر، فاروق مضطرؔ اور شب خون سے ملاقات ہو گئی۔ شب خون میں خوب اشاعتیں ہوتی رہیں۔ ان ہی دنوں جموں کے ایک سردار جی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی فرزندی حاصل کر لی اور آئندہ کے لئے شب خون میں میرا اور آنند لہر کا شائع ہونا منقطع ہو گیا۔ کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے دو سال کے بعد قانون کی پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ جانا کہاں ہے، کرنا کیا ہے۔

1972 میں بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری بہت بڑی بات تھی۔ لیکن 'یہ تو 1947 کا رفیوجی ہے' والے Tag کے ساتھ سسٹم میں کہیں کوئی داخلی دروازہ کھلا نہیں ملا۔ اپنی بے بضاعتی اور نظامیہ کی دانستہ بے حسی سے زبان کا ذائقہ تلخ ہو گیا اور طبیعت پر ایک لازوال افسردگی طاری ہوتی گئی۔ افسردگی کی یہ پرتیں اتنی دبیز ہیں کہ ان میں

دفن Fossils کی شناخت کر پانا بھی اب مشکل ہے۔

میری شاعری یا میری فکشن نگاری انہی احساسات کے دبے دبے سے، سہمے سہمے سے اظہار کی معدوم سی کوشش ہے۔افسانوں کا ایک مجموعہ 'ایک بوند زندگی' شائع کر چکا ہوں۔ چار مزید کتابیں مکمل ہونے کے باوجود کئی سال سے طباعت کے مختلف مراحل میں ہیں۔

کئی سال قبل انگریزی روزنامہ ''اسٹیٹ ٹائمز'' جموں کے نامہ نگار نے ایک انٹرویو لیتے وقت مجھ سے پوچھا تھا :

'شعر وادب کی کاوشوں کے عوض سوسائٹی نے جو کچھ آپ کو دیا کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟'

اس وقت میں نے جواب دیا تھا کہ'' ....سوسائٹی میرے پاس وفد لے کر نہیں آئی تھی کہ بلراج بخشی تم شاعری کرو یا افسانے لکھو۔ اظہار میری مجبوری ہے۔ سوسائٹی پر میرا کوئی احسان نہیں ہے''۔

میرا نظریہ آج بھی وہی ہے۔

●●●

(بلراج بخشی کی آپ بیتی کا یہ حصہ شیرازہ اردو، جلد 57، نمبر 9-7 سے ماخوذ ہے، جو 2019 میں شائع ہوا ہے۔ بلراج بخشی 29 نومبر 2024 کو سورگباش ہوئے۔ ادارہ)

”شیرازہ اردو“

کی بعض اہم خصوصی اشاعتیں

- سمپوزیم نمبر
- پنڈت جواہر لال نہرو نمبر
- مورخ حسن نمبر
- منشی پریم چند نمبر
- غالبؔ نمبر
- شیخ العالم نمبر
- شاہ ہمدان نمبر
- صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر
- غلام محمد صادق نمبر
- نوجوان نمبر
- فخر کشمیر نمبر
- عبدالاحد آزادؔ نمبر
- غلام رسول نازکی نمبر
- میکشؔ نمبر
- عمر مجید نمبر
- شمیم احمد شمیم نمبر

- ثقافت نمبر
- محی الدین قادری زورؔ نمبر
- محمد الدین فوقؔ نمبر
- ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ نمبر
- عجائبات نمبر
- لل دید نمبر
- سمینار نمبر
- شیر کشمیر نمبر
- افسانہ نمبر
- شاعر کشمیر مہجورؔ نمبر
- مغل اور کشمیر نمبر
- حامدیؔ کاشمیری نمبر
- غلام رسول سنتوشؔ نمبر
- عرشؔ صہبائی نمبر
- بخشی غلام محمد نمبر
- محمد یوسف ٹینگ نمبر

- پشکر ناتھ نمبر
- محمد یاسین بیگ نمبر
- جموں وکشمیر،لداخ نمبر (۱۱ جلدیں)
- حکیم منظور نمبر
- تاجران کتب نمبر
- ظہورالدین نمبر
- رفیق راز نمبر
- غلام نبی خیال نمبر
- فرید پربتی نمبر
- عبدالرحمان مخلص نمبر
- پی۔این۔کے بامزئی نمبر
- ترنم ریاض نمبر
- نور شاہ نمبر
- سفرنامہ نمبر (۲ جلدیں)
- عبدالغنی شیخ نمبر
- رحمان راہی نمبر

سالنامہ ''ہمارا ادب''

کی بعض خصوصی اشاعتیں

☆......لوک ادب نمبر

☆......مشاہیر کشمیر نمبر (۲ جلدیں)

☆......شیرازہ انتخاب نمبر

☆......شخصیات نمبر (۵ جلدیں)

☆......اولیاء نمبر (۵ جلدیں)

☆......ڈوڈہ نمبر

☆......مولانا رومی نمبر

☆......ہمعصر تھیٹر نمبر

☆......فیض احمد فیض نمبر

☆......سعادت حسن منٹو نمبر

☆......کرشن چندر نمبر

☆......تنقید نمبر

☆......فن افسانہ نگاری نمبر (۲ جلدیں)

☆......فن ترجمہ نگاری نمبر

☆......فن نظم نگاری نمبر (۲ جلدیں)

●●●

کلچرل اکادمی کی بعض اہم اردو مطبوعات

☆...... انوار ابوالکام ....مرتب: علی جواد زیدی

☆......کشمیری زبان اور شاعری (۳ جلدیں) مرتب: عبدالاحد آزادؔ

☆...... دیوان میرؔ ....مرتبہ: پروفیسر اکبر حیدری

☆......چنار رنگ ....مرتبین: غلام نبی خیالؔ، بشیر اختر

☆...... لل دید ....مرتبین: پروفیسر جیالال کولؔ، نندلال طالبؔ

☆......خیابانِ کشمیر...... مرتبہ: غلام نبی خیالؔ

☆......تفسیر غالبؔ ...... پروفیسر گیان چند جین

☆...... تذکرۂ شاعراتِ اردو ...... پروفیسر اکبر حیدری

☆...... اکادمی مخطوطات ....مرتبہ: مولوی محمد ابرہیم

☆...... ڈوگری لوک ادب اور پہاڑی آرٹ...... مترجم: لکشمی نارائن

☆......برج نور..........ادارہ

☆......انتخاب اردو ادب..............مرتبہ: نور شاہ

☆......جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء..........ٹھاکر پونچھی

☆......کشمیر میں عربی ادب کی تاریخ..........فاروق بخاری

☆......کشمیر میں اردو (۳ جلدیں) ...... پروفیسر عبدالقادر سروری

☆......نئی حسیت اور عصری شاعری ...... پروفیسر حامدی کاشمیری

☆......نکاتِ رقعاتِ غالبؔ ....اکبر علی خان

☆......پربت اور پنگھٹ (۲ جلدیں)............مرتبہ: محمد یوسف ٹینگ

☆......ریشیات............مرتبہ: پروفیسر اسداللہ وانی

☆......ساز کی لے تیز کرو (۲ جلدیں) ....ادارہ

☆......اردو کشمیری فرہنگ (۱۲ جلدیں) ......ادارہ

☆......جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ....جان محمد آزاد

☆......کلام اقبال: نادر رسالوں کے تناظر میں ......پروفیسر اکبر حیدری

☆......نیل مت پُران ......مترجم: ارجن دیو مجبور

☆......کلام مہجور (اردو ترجمہ) ....سلطان الحق شہیدی

☆......اقبال: احباب و آثار ....پروفیسر اکبر حیدری

☆......عشرت کشتواڑی (مونوگراف)............فدا کشتوڑی

☆......جموں کی تمدن تاریخ ....کے۔ڈی مینی

☆......کشمیر: فوک لور کے آئینے میں ....غلام نبی آتش

☆......کشمیر کی قدیم ذاتیں ....ڈاکٹر آفاق عزیز

☆......غلام نبی گورگارنی (مونوگراف) ....منشور بانہالی

☆......کلام انتخابِ سید رضا ....مرتب: ڈاکٹر سید شبیب رضوی

☆......مشاہیر کے نام خطوط، حامدی کاشمیری کے نام ....ادارہ

●●●

●●●